

پاکستان کا اسلامی مستقبل خطرے میں ہے دینی عناصر کے لیے لمحہ فکریہ

اگر کوئی جاگتے میں خواب دیکھنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ اگر نہ تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں انتخابی قوت نہیں بن سکیں اور نہ اس وقت ہیں۔ لے دے کے چند نشستیں جمعیت علماء اسلام (ف) اور چند نشستیں جماعت اسلامی کو مل سکتی ہیں۔

ہمارا سوال ان دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے یہ ہے کہ انہوں نے یہ دینی سیاسی جماعتیں کیوں قائم کر رکھی ہیں؟ اگر انہوں نے اپنی لیڈری کے لیے، مالی منفعت کے لیے یا اپنے فقہی مسلک کو زندہ رکھنے کے لیے قائم کی ہیں تو ہمارا انہیں سلام۔ لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم نے یہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لیے قائم کی ہیں تاکہ ریاستی قوت سے معاشرے میں اسلامی تعلیمات نافذ کی جاسکیں اور غیر اسلام (یعنی امریکہ و یورپ کی غلامی اور ان کی تہذیب کے غلبے) سے جان چھڑائی جاسکے تو پھر اخلاص اور فراست کا تقاضا ہے کہ آپ مل بیٹھ کر اس کے لیے ایک متفقہ پروگرام تیار کریں ☆ اور متحد ہو کر اس کی تنفیذ کے لیے سیاسی جدوجہد کریں۔ اپنے مطالبات دوسری سیاسی جماعتوں کے سامنے رکھیں اور ان میں سے جو آپ کے زیادہ سے زیادہ مطالبات مانے، اس کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیں اور کامیابی ملنے یا نہ ملنے دونوں صورتوں میں اپنے پروگرام اور مقاصد کے لیے جدوجہد جاری رکھیں۔ بنیادی بات یہ نہیں کہ آپ نشستیں کتنی جیتتے ہیں کیوں کہ اتنی نشستیں تو آپ بہر حال نہیں جیت سکتے کہ حکومت بنا سکیں اور اپنی مرضی کے اقدامات کر سکیں لہذا اپنے پروگرام کو اہمیت دیں اور اس کی بنیاد پر دوسروں سے اتحاد کریں اور نشستوں کے لیے ایک دوسرے سے نہ لڑیں۔

☆ مجوزہ متفقہ پروگرام تیار کرنا مشکل نہیں کیونکہ دینی سیاسی جماعتوں میں نظری اختلاف کم ہے (سارے دینی مکاتب فکر کا متحدہ پلیٹ فارم ملی مجلس شرعی نفاذ شریعت کے حوالے سے ایک متفقہ دستاویز تیار کر چکا ہے جو طبع شدہ موجود ہے)۔ بنیادی طور پر دو نکات اہم ہیں: ایک فرد اور معاشرے کی اسلامی تناظر میں تعمیر نو (اور اس کے لیے شریعت بل یا حجبہ بل پاس کرنے کی بجائے عملی اقدامات پر زور دیا جائے جیسے نظام تعلیم اور میڈیا کی اصلاح اور لوگوں کے دکھوں کو کم کرنا جیسے افلاس، بد امنی اور بے انصافی وغیرہ کا خاتمہ) اور دوسرے امریکی و یورپی غلامی سے نجات اور مغربی فکر و تہذیب کے چنگل سے نکلنا۔

اس وقت دینی سیاسی جماعتوں میں جو اختلاف و کشمکش برپا ہے وہ افسوسناک ہے اور اخلاص و فراست کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اگر غیر سیاسی بزرگ رہنما اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کچھ کر سکیں تو انہیں ضرور کوشش کرنی چاہیے۔

غیر سیاسی دینی قوتوں کی بے عملی

مساجد و مدارس میں کام کرنے والے علماء کرام اور معاشرے میں دینی کام کرنے والے افراد اور چھوٹے بڑے اداروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو سیاسی جدوجہد کی مشغولیت نہیں رکھتی۔ دوسری طرف مغرب کی ابلیسی قوتوں نے اپنے ہم نوا حکمرانوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں مصروف کار افراد اور اداروں کے تعاون سے پاکستانی معاشرے میں بگاڑ کی رفتار اتنی تیز کر دی ہے کہ اخلاقی قدریں رو بہ زوال ہیں اور معاشرے میں بے دینی زوروں پر ہے اور تیسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کل افراد معاشرہ (یا جدید اصطلاح میں سول سوسائٹی) ریاستی قوت کے بغیر بھی منظم و متحرک ہو کر فرد کی اصلاح اور اس کے مسائل کے حل کے لیے بہت سے کام موثر اور نتیجہ خیز انداز میں کر سکتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے معاشرے کی غیر سیاسی دینی قوتیں بھی اس غرض سے کسی پروگرام پر متحد و متحرک نہیں ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ دن بدن اسلام سے دور ہو رہا ہے۔ لہذا اخلاص اور فراست کا تقاضا ہے کہ غیر سیاسی ذہن رکھنے والے علماء کرام اور دینی عناصر مل بیٹھ کر فرد و معاشرے کی اصلاح کے کسی پروگرام ☆ پر متفق ہو کر جدوجہد کریں تاکہ پاکستان میں اسلام کے حق میں سیاسی تبدیلی آئے یا نہ آئے کم از کم معاشرتی تبدیلی تو آئے۔ ان دینی عناصر کو اس امر کی بہت فکر کرنی چاہیے کہ اگر پاکستان میں اسلام کے حق میں سیاسی تبدیلی نہ آئی (جس کا امکان بظاہر کم ہی نظر آتا ہے) اور خود انہوں نے بھی اسلام کے حق میں غیر سیاسی معاشرتی تبدیلی کے لیے کچھ نہ کیا تو اس معاشرے اور ملک کا اسلامی مستقبل کیا ہوگا؟

☆ یہ پروگرام کیا ہو سکتا ہے؟ ہم اس پر البرہان میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں (دیکھیے شمارہ مارچ و جولائی ۲۰۱۲ء) ہماری تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے لیے تین نکاتی اصلاحی پروگرام (۱- تعلیم ۲- تربیت و تزکیہ ۳- میڈیا) اور فرد کے مصائب کم کرنے کے لیے بھی تین نکاتی پروگرام (۱- افلاس کم کرنا ۲- انصاف مہیا کرنا اور ۳- امن و امان کی بحالی) پر عمل کرنا چاہیے۔

مدیر

ادھورا سچ

طالبان نائزیشن کی ذمہ دار ہماری سیاسی اور عسکری قیادت بھی ہے

پچھلے ہفتے جناب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری صاحب نے ”قانون کی حکمرانی کے ذریعے امن کا قیام“ کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے آخری روز کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک فکرائیز خطبہ دیا۔ اگرچہ ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اس کانفرنس میں صرف بھارتی پنج اور بار کیوں نمایاں رہا اور پاکستان میں وہ کون سے عناصر ہیں جو پاکستان اور بھارت میں شدید اصولی تنازعات کے علی الرغم بھارت کی قانون نوازی اور پاکستان کی مخدوش آئینی عمل داری کو نمایاں کرنا چاہتے اور پاک و ہند کی عدلیہ کو قریب لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ تاہم اس وقت زیر بحث جناب چیف جسٹس کا وہ فکرائیز خطبہ ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ ”میری رائے کے مطابق تنازعات میں الجھے ہوئے لوگوں کے مابین حقیقی امن مصالحانہ تصفیہ کی بدولت ہی قائم کیا جاسکتا ہے“ اور یہ کہ ”پاکستان آج ایسے حالات کا سامنا کر رہا ہے جہاں امن ایک سہانا خواب لگتا ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس غمزدہ ریاست کا حصہ خود ہی نہیں بنے بلکہ ہم ماضی میں کئے گئے گناہوں کی قیمت چکا رہے ہیں۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے کہ عرصہ دراز سے ہم نے اپنے آئین کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ وہ قومیں جو آئین کی نگریم کرتی ہیں اور اسے حقیقی طور پر رائج کرتی ہیں وہ چیلنجوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور تنازعات کا تصفیہ کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ محققین مشترکہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کامیابی سے آئین توڑنے اور قانون کی حکمرانی سے انحراف نے ہمیں بھٹکایا اور قانون کی حکمرانی کو پاکستان میں نابود کیا ہے اور یہی وہ حالات ہیں جنہوں نے تشدد اور لاقانونیت کی یہ فضا قائم کی ہے جس نے ہمیں عرصہ دراز سے اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔“

جناب چیف جسٹس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ”آئینی شقوں سے بہت سے انحرافات نے، جو آج بھی جاری ہیں، قومی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ ماضی میں آئینی انحرافات اور ناتواں قانون کی حکمرانی نے ہی موجودہ دور میں ملک کے کچھ حصوں میں عسکری اور تخریب کارانہ نظریات کو جنم دیا جہاں پر ابھی عسکریت پسندی نے جنم لینا شروع کیا ہے جو بعد ازاں حکومتی رٹ کے اجراء میں بھی مزاحم ہو سکتی ہے لہذا حتمی طور پر ریاست کو ان عسکری تنظیموں کے خلاف کارروائی کرنی

چاہیے لیکن ضروری ہے کہ یہ کاروائی آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کی جائے۔

اس خطبے میں جناب چیف جسٹس صاحب کے اس فرمان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں معاشرے کو امن و امان کے جس فقدان اور جس دہشت گردی اور تشدد کا سامنا ہے اس کی بنیادی وجہ آئین سے انحراف اور قانون پر عمل درآمد نہ کرنا ہے۔ قانونی، منطقی اور فطری طور پر اس مسئلے کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کو آئین اور قانون پر عمل درآمد کرنا چاہیے تاکہ امن و امان بحال ہو جائے اور تشدد پر آمادہ اور آئین سے منحرف گروہ واپس آئینی دائرہ کار میں آجائیں جیسا کہ انہوں نے اپنے اس یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسا ممکن ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ ”میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر آئین اور قانون کی پاسداری ان کی بنیادی روح کے مطابق کی جائے تو تخریب کاری کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اور تمام دوسرے مسائل کا بھی خاطر خواہ حل نکل آتا ہے۔“ لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے اپنی دلیل سے مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے یہ فرمایا ہے کہ ریاست کو ان عسکری گروپوں کے خلاف آئین کے اندر رہتے ہوئے کاروائی کرنی چاہیے جو تشدد کا سبب ہیں۔

ہمارے فہم کی حد تک پاکستان میں امن و امان کی بُری حالت اور تشدد و دہشت گردی کے دو اصولی سبب ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی سبب یہ ہے کہ حکومت قانون پر مؤثر عمل درآمد نہیں کرتی جس کی وجہ سے چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور کرپشن کرنے والوں کو سزا نہیں ملتی حالانکہ ملک میں اسلامی حدود نافذ ہیں۔ ساری دنیا میں جو ملک امن و امان میں بہتری کے حوالے سے سب سے پہلے نمبر پر ہے وہ سعودی عرب ہے کیونکہ وہاں اسلامی حدود نافذ ہیں لیکن پاکستان میں یہ حدود کتاب قانون میں تو درج ہیں لیکن حکومت ان پر عمل درآمد نہیں کرتی لہذا ملک میں جرائم کی کثرت ہے اور امن و امان کی حالت نہایت پتلی ہے۔ اگر حکومت ان قوانین پر مؤثر عمل درآمد کرے تو بہترین نتائج نکل سکتے ہیں۔

تشدد اور دہشت گردی کے خارجی سبب کے دو اجزاء ہیں: ایک پاکستانی طالبان جن کا مطالبہ ہے کہ پاکستان میں شریعت نافذ کی جائے اور اگر حکومت پاکستان نہیں کرتی تو ہم دہڑے کے زور سے کرائیں گے۔ ہمیں پاکستانی طالبان کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کہ اگر حکومت پاکستان ملک میں شریعت نافذ نہ کرے تو انہیں ریاست کے خلاف بغاوت کر کے زبردستی اور اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنے کا حق ہے۔ ہماری رائے میں پاکستان میں پُر امن طریقے سے شریعت نافذ ہو سکتی ہے کیونکہ یہ آئینی تقاضا ہے [دستور ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۳۱(۱)] لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ حکومت ملک میں شریعت نافذ کر کے طالبان کا یہ مطالبہ پورا کیوں نہیں کر دیتی تاکہ طالبان کے غبارے سے ہوا نکل جائے اور وہ غیر مؤثر ہو جائیں اور آئینی دائرے میں آنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ اگر سکول جلاتے ہیں کہ حکومت ان کی

بچیوں کو غیر اسلامی مغربی تعلیم دے کر بے حیا بناتی ہے تو حکومت پاکستان نظام تعلیم کو اسلامی کیوں نہیں بنا دیتی جب کہ یہ آئینی تقاضا بھی ہے [دستور کی دفعہ ۳۱ (G۲)]۔ اگر وہ اسلامی نظام عدل کا تقاضا کرتے ہیں تو حکومت ان کا یہ جائز اور آئینی تقاضا پورا کیوں نہیں کر دیتی؟ (حسب دفعہ ۲۲۹) اگر وہ میڈیا کی فحاشی اور عریانی کو غلط کہتے ہیں اور سی ڈیز کی دکانیں جلاتے ہیں تو حکومت میڈیا سے فحاشی و عریانی کا خاتمہ کیوں نہیں کرتی جو آئینی تقاضا ہے [حسب دفعہ ۳۷ (G)]

طالبان کا رویہ غلط ہے اور غیر آئینی ہے لیکن وہ تو رد عمل ہے اصل زیادتی اور غلطی بلکہ آئین اور قانون کی اسلامی دفعات پر عمل نہ کرنے کے جرم کی مرتکب تو حکومت پاکستان ہو رہی ہے جو ان دفعات پر مخلصانہ عمل نہیں کر رہی اور جس کے رد عمل میں طالبان سامنے آئے ہیں۔ لہذا ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس تشدد اور دہشت گردی کی ذمہ دار حکومت پاکستان ہے۔ اسے آئین کی اسلامی دفعات پر مخلصانہ عمل کرنا چاہیے تاکہ طالبان کا مطالبہ ہی ختم ہو جائے اور وہ غیر مؤثر ہو کر آئینی عمل داری میں آجائیں اور انہیں ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

ملک میں تشدد اور دہشت گردی کی دوسری بڑی خارجی وجہ امریکہ و یورپ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ اور حکومت پاکستان کا اس کی حمایت کرنا ہے۔ یہ بھی دستور کی خلاف ورزی ہے کیونکہ دستور پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مسلم ممالک سے دوستی پر استوار کرنے کا حکم دیتا ہے (دفعہ ۴۰) جب کہ حکومت پاکستان افغانستان کے خلاف امریکہ و نیٹو کی حمایت کرتی ہے۔ آئین ملکی سرحدوں کو تقدس عطا کرتا ہے لیکن حکومت ڈرون حملوں کے خاتمے اور شمالی علاقوں اور بلوچستان میں امریکی و بھارتی مداخلت کا رد کو روکنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کرتی اور پارلیمنٹ کی طرف سے دو دفعہ امریکہ و نیٹو کے خلاف قراردادیں منظور کرنے کے باوجود امریکی غلامی سے باز نہیں آتی۔ ایک آدمی ناجائز اور بہیمانہ قتل ہو جائے تو میڈیا شور کرتا اور عدالت سوموٹو ایکشن لیتی ہے لیکن یہ حکومت ۴۰ ہزار آدمی مروا چکی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ چند لاکھ کی کرپشن پر بھی میڈیا اور عدالت حرکت میں آتے ہیں جو بہت اچھی بات ہے لیکن حکومت پاکستان کھربوں روپے کا نقصان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں کر چکی ہے اور لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے؟

آخر میں ہم دوبارہ جناب چیف جسٹس آف پاکستان کے موقف کی حمایت کرتے ہیں کہ امن کی کنجی آئین و قانون کی عمل داری میں ہے لہذا حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ آئین و قانون پر عمل کرے تاکہ ملک سے تشدد اور دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکے۔

مدیر

امریکہ کی شکستہ وریخت اور مسلم قوت کا راز

امریکہ کی بیس ریاستوں نے وفاق سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ امریکہ کے ٹوٹنے کی ابتداء ہو چکی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کی ایک سپر پاور (روس) اور اس کے نظریے (کمیونزم، سوشلزم) کو توڑنے کا سبب افغانی مسلمان بنے اور اب دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کے ٹوٹنے کی ابتداء ہوئی ہے تو اس کا سبب بھی افغانی مسلمان ہیں؟ سوال یہ ہے کہ افغانی مسلمانوں کی اس طاقت کا راز کیا ہے؟ جدید ٹیکنالوجی سے وہ محروم ہیں بلکہ ان کے ہاں تو سرے سے تعلیم ہی موجود نہیں، نہ ان کے ہاں سیاسی و معاشی استحکام ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ کچھلی دفعہ وہ اس لیے جیت گئے کہ امریکہ و یورپ اور پاکستان و مسلم دنیا کی حمایت انہیں حاصل تھی لیکن اس دفعہ تو وہ امریکہ و یورپ کی متحدہ طاقت کے خلاف لڑ رہے تھے اور پاکستان اور مسلم دنیا کا وزن بھی ان کے خلاف تھا۔ اس کے باوجود وہ جیت گئے ہیں اور امریکہ نہ صرف افغانستان سے ناکام ہو کر بھاگنا چاہ رہا ہے بلکہ داخلی طور پر اس کے ہاں شکستہ وریخت کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ آخر افغانی مسلمانوں کی اس قوت کا راز کیا ہے؟

اس کا ایک ہی معقول جواب ہے اور وہ ہے ان کا جذبہ ایمانی جس کے نتیجے میں وہ اپنا تن من اور دھن اللہ کی راہ میں لٹا دینے پر بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں اور کفار کی اطاعت پر ان کے دل راضی نہیں ہوتے۔ یہودی اور امریکی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خود کش حملوں کی مذمت کرنا آسان ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک آدمی اس دنیا میں اپنی سب سے بڑی متاع یعنی اپنی جان بھی قربان کر دے، یہ معمولی بات نہیں۔ اس کا محرک صرف جذبہ جہاد ہے یعنی اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دینا۔

سوال یہ ہے کہ افغانیوں میں یہ جذبہ ایمانی اور جذبہ جہاد کیسے باقی ہے جب کہ باقی دنیا کے مسلمانوں میں اور خود پاکستانیوں کی اکثریت میں یہ موجود نہیں؟ اس کا جواب اصلاً تو ایک ہی ہے لیکن اس کے پہلو کی ایک ہیں مثلاً

- افغان معاشرے نے اپنے کلچر میں وہ اسلامی روح برقرار رکھی ہے جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور حاصل ہے۔

- اس روح کے برقرار رہنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے کفر والحاد پر مبنی مغربی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کیے۔

- اس کی ایک وجہ ہے افغانوں کی غربت اور جفاکشی اور مردہ شہری سہولتوں اور آسائشوں سے محرومی اور تن آسانی سے دوری کہ بقول اقبال ۷

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی

یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

اس سے مسلمان عموماً اور ہم پاکستانی خصوصاً کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ یہ کہ اپنے جذبہ ایمانی کی حفاظت کی جائے اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے بچا جائے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے نظام تعلیم و تربیت۔ ہمیں اور ہماری نسلوں کو نا مسلمان بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہمارا مغرب زدہ نظام تعلیم و تربیت ہے اور ہماری آئندہ نسلوں کو صاحب ایمان اور یکسو اور باعمل مسلمان بنانے کا بنیادی نسخہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظام و تربیت کی اصلاح کریں، اسے مغربی فکر و تہذیب کے الحادی اثرات سے بچائیں اور اس کی اسلامی تشکیل نو کریں۔ البرہان اسی کا علم بردار ہے اور اس کے اکثر مضامین اسی کی وضاحت کرتے ہیں۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زراعت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام..... پتہ.....

..... فون.....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

اقبال اور عصری نظام تعلیم

اقبال نے جب اپنی بصیرت سے جدید نظام تعلیم کا جائزہ لیا تو انہیں چند بڑی کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں جنہیں انہوں نے اپنی تنقید اور صاف گوئی کا نشانہ بنایا اور ماہرین تعلیم کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔ وہ مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں جہاں یہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش و خروش، نہ حکمت و بصیرت ہے نہ فکر و نظر۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ
وہ دانشکدوں کی کورنگاہی، بے ذوقی اور خانقاہوں کی کم طلبی و بے توفیقی دونوں سے نالاں اور
دونوں سے گریزاں ہیں۔

جلوتیان مدرسہ کورنگاہ مردہ ذوق
خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

عصری دانشگاہوں کا ظلم عظیم

اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتناء اور قلب و روح کی نشوونما، روحانی ارتقاء اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس سے غفلت کر کے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا، جس کے سبب اس کے قوی غیر متوازن، اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن آئی ہے۔ نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی عقل باریک مگر روح تاریک ہے اور اس کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے۔

وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے اس لیے جب بھی وہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ امر واقعہ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ خالی، اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے مگر اس کا چہرہ بہت تازہ و بارونق اور اس کا ظاہر بہت چاق و چوبند ہے۔ اس کی عقل

روشن مگر بصیرت اندھی ہے، بے یقینی اور یاس و قنوط ان کی زندگی کا حاصل اور محرومی ان کی قسمت ہے۔ یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاش ہیں۔ وہ اپنی ذات کے منکر ہیں مگر دوسروں پر ایمان لاتے ہیں۔ اغیار و اجانب ان کے اسلامی خمیر سے دیر و کلیسا کی تعمیر کر رہے ہیں، اور ان کی صلاحیتیں ”صرف درمیکدہ“ ہو رہی ہیں۔ سخت کوشی اور جفاکشی کی بجائے نرمی اور تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔ ان کی پست ہمتی کا یہ حال ہے کہ امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں یا پیدا ہوتے ہی گھٹ کے مرجاتی ہیں۔ نئی دانشگاہوں نے ان کے دینی جذبات کو پوری طرح سلا دیا ہے اور ان کے وجود کو ہم نفس عدم بنا دیا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے ناواقف اور اپنی صلاحیتوں سے بے پروائی ان میں عام ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اپنی روح کا سوداروٹی کے چند ٹکڑوں پر بھی کرتے اور ضمیر فروشی کر سکتے ہیں۔ ان کے معلم بھی ان کی قیمت اور حیثیت عرفی سے نا آشنا ہیں اس لیے انہوں نے ان کو شرف و عظمت کے راز سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ مومن ہیں لیکن موت کی لذت سے بے خبر اور تو حید کی طاقت سے ناواقف ہیں۔ وہ فرنگ سے تہذیب کے لات و منات کی در آمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے اور فرزندِ حرم ہو کر بھی ان کا دل ”طواف کوئے ملامت“ اور ”سجدہ پائے صنم“ سے متغیر نہیں۔ فرنگ نے انہیں بغیر حرب و ضرب اور قتل و غارت کے مار ڈالا ہے۔ ان کی عقلیں بے جھجک، ان کے دل پتھر اور نگاہ بے باک ہے۔ ان کے قلوب بڑے سے بڑے حوادث کی چوٹ سے بھی نہیں پگھلتے اور ان کے علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل، سب کا مرکز مادہ ہے۔ ان کے دلوں میں افکار تازہ کی کوئی نمود نہیں، ان کے خیالات میں کوئی بلندی نہیں اور ان کی زندگی پر جمود و تعطل کی برف جمی ہوئی ہے۔

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ
شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبقِ شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدائے لا الہ الا اللہ
مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟
مے یقین سے ضمیر حیات ہے سوز
نصیب مدرسہ یا رب یہ آبِ آتشناک!

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
 دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
 آہ مکتب کا جوان گرم خوں
 ساحرِ افرنگ کا صید زبوں
 نوجواناں تشنہ لب خالی ایان
 شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ
 کم نگاہ و بے یقین و ناامید
 چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
 ناکساں منکر ز خود مومن بغیر
 خشت بند از خاک شاں معمارِ دیر

اقبال نئی نسل کے نوجوانوں سے کیا توقعات اور ان کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
 ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
 ایک قطعہ میں کہتے ہیں ۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
 خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے
 خطاب بہ نوجوانان اسلام اور دوسری نظموں میں ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی جھلک دیکھی
 جاسکتی ہے۔ طلباء علی گڑھ کالج کے نام ”عشق کے دردمند“ نے اپنے پیغام میں صاف صاف کہا۔

جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمنِ حجاز کا
 اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
 ان کی نظم ”ایک نوجوان کے نام“ میں ان کے احساسات بڑی وضاحت سے آگئے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
 لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
 امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
 نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
 کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی
 عقابِ روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
 نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
 نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
 امید مردِ مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں
 نہیں تیرا نشین قصر سلطانی کے گنبد پر
 تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
 وہ جب مسلم جوانوں کو اسلام کی بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری
 طور پر انہیں صدمہ ہوتا ہے۔ اپنی نظم ”ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام“ میں کہتے ہیں :-
 تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زنارِی برگساں نہ ہوتا
 انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
 افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
 دیں مسلک زندگی کی تقویم دیں سرِ محمدؐ و ابراہیم
 دل در سخن محمدؐ بند اے پور علیؑ ز بو علی چند
 چوں دیدہ راہ ہیں نداری قائدِ قرشیؐ بہ از بخاری
 اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظامِ تعلیم کو قرار دیتے ہیں۔ جس
 کے ہاں اخلاق پر کوئی زور نہیں اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے نو جوانوں کے
 دل سوز دروں سے خالی اور ان کی نظریں غیرِ عقیف ہیں۔ تعلیم یافتہ نو جوانوں کی زبان بہت تیز ہے، لیکن
 ان کی آنکھوں میں اشکِ ندامت اور دل میں خوف و وحشت ذرا بھی نہیں۔
 جو آنکھ کہ ہے سرمہٗ افرونگ سے روشن
 پر کار و سخن ساز ہے نمِ ناک نہیں ہے
 وہ ان سب باتوں کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں جنہوں نے

نوجوانوں کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے، اور ان کی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ دوسرا ذمہ دار وہ حد سے بڑھی ہوئی ”عقلیت“ کو بھی سمجھتے ہیں جو اولوالعزمیوں اور پُرخطر راہوں سے روکتی، اور ہر قدم پر مصلحت سنجی اور عافیت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے۔

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، اسباب طلبی اور عہدوں، ملازمتوں، اور اونچی کرسیوں کو تعلیم کے مقاصد سمجھنا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لیے علم دوائے نافع نہیں سم قاتل وقاطع ہے اور ایسے رزق سے موت بہتر ہے۔

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
مغربی تعلیم پر معاد کی بجائے معاش کا تصور جس طرح چھایا رہتا ہے وہ اس کے لیے جان لیوا ہے۔
اس تعلیم کا یہ فیض ہے کہ مرغ چمن محروم ہوا اور فطرت بے رنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ روٹی بھی ہاتھ میں نہیں
تھماتی اور دوسرے ہاتھ سے روح بھی قبض کر لیتی ہے۔

نوا از سینہ مرغ چمن برد
ز خوں لاله آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں در کف ندارد جاں ز تن برد
جدید تعلیم کے مجرمانہ کردار کا اقبال نے بے باکی سے پردہ چاک کیا اور اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔ حد سے زائد فکر معاش، ناروا مصلحت بینی، عافیت کوشی، مصنوعی تہذیب اور نقلی زندگی اس تعلیم کی نمایاں پیداوار ہیں۔ اقبال نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا
جو کہتا تھا خرد سے بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش
نئی تعلیم پر اقبال کے غم و غصہ اور سخت گیری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ یہ تعلیم بطالت و قحط، جمود
و جمود، آرام طلبی و لذت کوشی کی تعلیم دیتی ہے اور زندگی کو بحرِ نجد بنا دیتی ہے۔ وہ طالب علم کو دعا دیتے
ہوئے کہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
اسی طرح یہ تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے
مستقبل کے لیے نوآبادیات کی زمیں فراہم اور ہموار کرتی ہے، اور نو جوانوں کو افرنگ زدہ بناتی ہے اور بلند
معیار زندگی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے نیز مشرق کی روایات و خصوصیات کو ختم
کر کے وہاں وہ مغربی معاشرہ برپا کر دینا چاہتی ہے، جہاں بقول میکا لے شکل و صورت کے لحاظ سے
مشرقی لیکن ذہن و طبیعت کے اعتبار سے مغربی انسان پائے جانے لگیں۔

مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی بنیاد کفر و الحاد یا پھر
ذہنی انتشار اور فکری انارکی پر ہے اسی طرح وہ یہ تمام ذہنی بیماریاں نئے دماغوں میں اتار دیتی
ہے۔ فکر و فلسفہ، آزادی رائے، حریت خیال اور آزادانہ غور و خوض کے نام سے ذہنی بے ربطی اور
پریشان خیالی کو جنم دیتی ہے۔ اقبال کے خیال میں غلط فہمی سے کورچشی اور عالمانہ بے دینی سے
نادانی بہتر ہے۔

زمن گیر ایں کہ مردے کو چشمے ز بینائے غلط بینے کو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے کو کیش ز دانشمند بے دینے کو تر

اقبال کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ ان ذہنی جمناسٹکوں سے کیا حاصل جو انسان کو خلا باز اور ہوا پر واز
بنادیں لیکن اس کے جھے ہوئے قدم بھی اکھڑ جائیں اور وہ اپنا مقام بھی کھو بیٹھے۔

ازاں فکرِ فلک پیا چہ حاصل کہ گرد ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارہ ابرے کہ از باد بہ پہنائے فضا آوارہ گردد
یہ نظام تعلیم انسان کو مشینوں، صنعتوں اور ترقیوں کے آگے بے قیمت و بے حیثیت بنا دیتا ہے
حالانکہ انسان ہی بحر وجود کا گوہر مقصود اور مزرع ہستی کا حاصل ہے۔ دنیا کو انسان کے تابع ہونا چاہیے نہ

کہ انسان کو دنیا اور متاع دنیا کے ۛ

منہ از کف چراغ آرزو را بدست آور مقام ہائے وہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم بخود بار و بشکن چار سو را
دو گیتی را بخود باید کشیدن نباید از حضور خود رمیدن
بہ نور دوش ہیں امروز خود را ز دوش امروز نتوان ربودن

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو

تو بندہٴ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی

وہ پاکِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

اقبال کی نظر میں فکرِ بشری وحی الہی اور فیضانِ سماوی کے بغیر خام اور ناتمام رہتی ہے۔ اس لیے فکری
پختگی کے بغیر اسے شروع سے آزاد اور بے قید کر دینا پریشانی خیزی اور ژولیدہ نگاہی کو دعوت دینا ہے۔
’آزادیِ فکر‘ کے عنوان سے انہوں نے ایک بڑا بصیرت افروز اور معنی خیز قطعہ کہا ہے ۛ

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی

رکھتے نہیں جو فکر و تدبیر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مشرق میں ناپختہ افکار و فلسفہ نے جو بائیں شکل اختیار کر لی ہے اور غیر ہضم شدہ خیالات نے جس
طرح دنیا میں ذہنی بے اطمینانی پیدا کر دی ہے وہ بھی کالج کا عطیہ ہے جو ہر نئی ذہنی ایچ کو فلسفہ کا نام دے
دیتا ہے ۛ

پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر

خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

”عصر حاضر“ کے عنوان سے اقبال نے ایک قطعہ میں مشرق و مغرب کی بنیادی خرابیوں کو طشت
از بام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشینی دور کی تیز روی اور عجلت پسندی نے ہر شے کی پختگی ختم کر دی ہے اور
فلسفہ کو بے ربط بنا دیا ہے۔ دیارِ فرنگ میں عشق و محبت کو ان کا حقیقی مقام اسی لیے نہیں ملا کہ لادینیت نے

اس کا کوئی مرکز باقی نہیں چھوڑا اور مشرق میں عقل کو صحیح مقام اس لیے نہیں ملا کہ افکار میں کوئی تسلسل نہ تھا۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط نظام
مردہ لا دینی افکار سے افرونگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

نظام تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں بیدار کرتا۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے لیکن یہ دانش گاہیں اس سے بھی تنگ دائروں میں بند ہیں ان میں جا کر عبقری دماغ بھی امامت عصر کی بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں۔

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پر تو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تنگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو
اقبال کہتے ہیں کہ نئی نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں بلکہ وہ یورپ کی پرچھائیں ہے اور اس کی
مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچہ ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے لیکن
اس میں روح نہیں پھونکی۔ اس کا وجود وہ مرصع نیام ہے جس میں کوئی تنقید قاطع نہیں۔ اقبال بڑے مزے
سے کہتے ہیں کہ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے لیکن میری نظر میں خود اس نسل ہی کا بود و وجود ہم
نفس عدم ہے۔

ترا وجود سراپا تجلی افرونگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اقبال کی رائے ہے کہ مغربی نظام تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے اور انہیں مروان کار کی بجائے مرد بیمار بنادیا ہے اور بانکا بھیلہ، صباحت پسند بن کر رہنا سکھا دیا ہے۔ ان میں نزاکت و ملاحظت، نرمی اور تحنث اور نسائیت پیدا کر کے جدوجہد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں جو مجاہد سے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے اور مصاف زندگی میں اسے سامان آرائش دے کر اس کے ہتھیار لے لے۔

اقبال بڑی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ پر خلوص انداز میں نئی نسل کے مربی سے درخواست کرتے ہیں، وہ جب ایک شفیق استاد اور مہربان و غمخوار مربی کی زبان سے یہ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں اور پوری ملت کا غم ان کے وجود میں سمٹ آیا ہے۔

اے پیر حرم رسم و رہ خاقانی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارہ شگانی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زور جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتمہ سری کا

مولانا مدنیؒ کا مرتب کردہ نصاب ایک تجزیاتی مطالعہ (دوسری قسط)

نصاب اور نصابی کتب

دینی مدارس والے نصاب (Curriculum) اور نصابی کتب (Text books) میں بالعموم فرق نہیں کرتے بلکہ نصاب کا لفظ نصابی کتب کے لیے استعمال کرتے ہیں جب کہ جدید اصطلاح میں نصاب سے مراد یہ طے کرنا ہے کہ کیا پڑھایا جائے گا یعنی مواد تدریس کا تعین اور پھر اس نصاب کے مطابق نصابی کتب کی تیاری یا انتخاب کا مرحلہ آتا ہے۔ علوم کی تقسیم میں بھی اسلامی روایت اور آج کل کی رائج مغربی تعلیم کے تصورات میں فرق ہے۔ اسلامی روایت میں علم سے مراد ہے علم وحی یعنی قرآن و سنت اور دیگر علوم (Disciplines) جن میں عقل و مہارت کا دخل ہوا نہیں فنون کہا جاتا ہے یا علوم آلہ یعنی وہ علوم جو بنیادی علم سے براہ راست متعلق ہوں جیسے عربی زبان، اسلامی فقہ، تاریخ وغیرہ۔ انہیں معاون علوم بھی شمار کر لیا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب کے تعلیمی تصورات میں علوم کی دو بڑی تقسیمات ہیں: عمرانی یا سماجی علوم (جیسے تاریخ، فلسفہ، معاشیات وغیرہ) اور خالص سائنسی علوم (جیسے ریاضی، کیمیا، طبیعیات وغیرہ)۔ مذہب اور لسانیات سماجی علوم کا ایک جزو گردانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید یونیورسٹیوں میں شعبہ علوم اسلامیہ عموماً فیکلٹی آف سوشل سائنسز کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

بہر حال اس تمہید کے بعد عرض یہ ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مرتب کردہ نصاب ایک جامع نصاب ہے جس میں مرکزی حیثیت قرآن و حدیث کو دی گئی ہے جنہیں وہ بنیادی علوم میں شمار کرتے ہیں۔ معاون علوم میں، جنہیں وہ اکثر فنون کہتے ہیں، تمام اہم عمرانی اور سائنسی علوم شامل ہیں۔ لسانیاتی پالیسی کو وہ الگ بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد دنیاوی مہارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم اسی ترتیب سے ان کے مرتب کردہ نصاب کی کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

قرآن و حدیث

جیسا کہ معروف ہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے درس نظامی کے نام سے جو نصاب ترتیب دیا تھا اس میں قرآن و حدیث کو مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اس میں یہ حکمت پیش نظر رکھی گئی تھی کہ قرآن و

حدیث کی ایک ایک کتاب (بیضاوی اور مشکوٰۃ) پڑھا کر عربی زبان اور معاون اسلامی علوم و دینی علوم میں انہیں طاق کر دیا جائے تاکہ فارغ التحصیل ہو کر جب وہ مسلم ریاست اور معاشرے کے مفید رکن بن جائیں اور باروزگار ہو جائیں تو ان کی علمی بنیادیں اتنی مضبوط ہوں کہ مزید علم کا حصول یا تطبیقی مرحلہ ان کے لیے آسان ہو۔ مولانا مدنیؒ اس حکمت یا پالیسی کو رد کر دیتے ہیں، اسے عیب گردانتے ہیں اور قرآن و حدیث کو اپنے نصاب میں مرکزی حیثیت دیتے ہیں (اصول قوانین کلیہ ۱۰)۔

من جملہ دوسرے دلائل و اسباب کے مولانا کے موقف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب مسلم حکومت موجود نہ تھی اور انگریز کی استعماری حکومت کے لیے کارکن تیار کرنا انہیں درکار نہ تھا۔ جب سرکاری ملازمتیں میسر نہ تھیں تو ان کا رجحان یہ ہوا کہ طلبہ اسلامی علوم تو جم کر پڑھیں لیکن روزگار کے لیے وہ ایسی مہارتیں حاصل کر لیں جو اس وقت کے معاشرے کے ماحول اور ضرورت کے مطابق انہیں روزگار مہیا کر سکیں۔ اس حکمت اور اصول کے مطابق مولانا نے قرآن و حدیث کو بنیادی علوم قرار دیتے ہوئے جو کتابیں تجویز کیں وہ یہ تھیں:

قرآن و علوم القرآن

تین سالہ پرائمری میں ناظرہ قرآن کی تکمیل و تجوید کی مشق۔ مولانا کا اصرار ہے کہ بچوں کو قرآن پڑھانے والا قاری ماہر تجوید ہونا چاہیے تاکہ بچوں کے مخارج ابتداء ہی سے درست ہو جائیں۔ پانچ سالہ ثانویہ کے پہلے چار سالوں میں ترجمہ قرآن حضرت شیخ الہندیؒ کی تکمیل اور چوتھے و پانچویں سال میں موضوع القرآن از شاہ عبدالقادرؒ ۸ سالہ مرحلہ عالیہ میں تین تفسیریں یعنی تفسیر عزیزی، جلالین اور بیضاوی مع الفوز الکبیر اصول تفسیر میں۔

حدیث و علوم الحدیث

۱- سیرۃ النبیؐ: ابتدائیہ کے دوسرے سال میں سیرۃ النبیؐ میں رسالہ ہمارے نبیؐ اور سال سوم میں خاتم الانبیاء۔ اسی طرح ثانویہ کے پہلے سال میں رحمۃ للعالمین، جلد اول۔ عالیہ کے سال خامس میں شمائل ترمذی اور قاضی عیاض کی الشفاء۔

۲- متون حدیث: عالیہ کے سال اول میں چہل حدیث از مولانا اصغر حسین دیوبندی و اربعین نووی۔ سال ثانی و ثالث میں اعلیٰ السنن و کتاب الآثار للامام محمد۔ سال چہارم میں موطا امام محمد، سال سادس میں مشکوٰۃ المصابیح اور سال سابع میں ترمذی، مسلم اور ابن ماجہ جب کہ سال ثامن میں بخاری، ابوداؤد، نسائی

اور شرح معانی الآثار۔

۳- اصول حدیث: عالیہ سال خامس میں شرح نخبۃ الفکر- سال سادس میں الفیۃ العراقی فی اصول الحدیث

تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ مولانا کے تجویز کردہ نصاب میں نہ صرف قرآن و حدیث کا مواد زیادہ ہے بلکہ دیوبند اور اس کے تتبع میں کام کرنے والے اکثر پاکستانی مدارس میں عالمیہ کے آخری سال میں دورہ حدیث (یعنی مرور سرلیج جس میں تحقیق و تدبر کا موقع کم ملتا ہے) کے تصور کے بھی خلاف ہے اور انہوں نے مطالعہ متن حدیث کو مختلف مراحل میں پھیلا دیا ہے تاکہ متون کتب حدیث کا سنجیدہ مطالعہ کیا جاسکے۔

اسلامیات: (قرآن و حدیث، سیرت و فقہ اور سوانح کے علاوہ عقیدہ و کلام وغیرہ) پرائمری سال اول: وضو اور نماز کی عملی تعلیم- قاعدہ تعلیم الاسلام و تعلیم الاسلام، مع کتابت- سال ثانی: تعلیم الاسلام ۲- سال ثالث: تعلیم الاسلام ۳، ۴- ثانویہ سال ثالث و رابع: عقائد اسلام مصنفہ حقانی- عالیہ سال اول کتاب الصلوٰۃ از ملتقی الابجر- سال خامس شرح عقائد نسفی و شرح نخبۃ الفکر- سال سادس شرح عقیدہ طحاویہ- سال سابع: حجۃ اللہ البالغہ۔

معاون اسلامی علوم رفنون: ان میں مندرجہ ذیل عمرانی علوم شامل تھے:

تاریخ: ثانویہ کے سال ثانی میں تاریخ الامم (عرب قبل از اسلام- سال ثالث میں تاریخ الحریہ فی الاسلام از محمد دین فوق، سال رابع میں تاریخ الاسلام ۴، سال خامس میں تاریخ سندھ قدیم و تاریخ الامم- عالیہ کے سال اول میں فصول اکبری، تاریخ سلاطین ہند عہد اسلام از اکبر خان نجیب آبادی و تاریخ حروب صلیبیین از شرر لکھنوی- سال دوم: تاریخ آل عثمان از مولوی انشاء اللہ خاں- سال ثالث میں آئینہ حقیقت نما از اکبر خان نجیب آبادی و تاریخ اندلس و سپین- سال رابع میں تاریخ ترکیہ جدیدہ اور سلطان نور الدین محمود- سال خامس میں آئینہ حقیقت نما، تاریخ افغان جدیدہ- ہندوستان در عہد اورنگ زیب از مرزا سمیع اللہ بیگ، آزادی ہند مصنفہ انڈریوز، کشف الغمہ عن جمیع الامم للشعرانی۔

تاریخ کے اس بھاری بھر نصاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مدنیؒ تاریخ قدیم و جدید کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

جغرافیہ: ابتدائیہ کے تیسرے سال میں صوبے کا جغرافیہ، ثانویہ سال اول میں جغرافیہ ہند مع نقشہ، سال سوم میں جغرافیہ ایشیا مع نقشہ۔

قانون (فقہ و اصول فقہ): ثانویہ سال اول میں رسالہ علم الفقہ ۱۲، ۱۴ از مولانا عبدالحکیم - سال ثانی میں علم الفقہ ۲، ۳ - سال ثالث میں علم الفقہ ۴، ۵ - عالیہ کے سال دوم میں اصول شاشی - سال ثالث میں نور الانوار کامل و شرح نقایہ لملا علی قاری یا شرح وقایہ نصف اول - سال رابع میں توضیح کامل و ہدایہ اولین - سال خامس میں ہدایہ آخرین و فواتح الرحموت - سال سادس میں بقیۃ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت - سال سابع میں ہدایہ المجتہد لابن رشد [تقابل مطالعہ] اور سال ثامن میں دستور انگلستان [تقابل مطالعہ] منطق و فلسفہ: ثانویہ کے سال رابع میں تیسیر المنطق - خامس میں ایسا غوجی و قال اقول - عالیہ سال دوم میں قطبی تصدیقات - سال ثالث: قطبی تصورات مع میر - سال رابع: سلم العلوم -

معاشیات: ثانویہ کے سال رابع میں کنگال ہندوستان - سال خامس میں مظلوم کسان - عالیہ کے سال ثالث و رابع میں معاشیات ہند للہرنی

سوانح: ثانویہ سال اول: اورنگزیب از شبلی نعمانی، سال ثانی: حیاۃ سلطان صلاح الدین مصنفہ حکیم احمد حسین، سال رابع میں الفاروق از شبلی نعمانی اور سال خامس میں سیرۃ عمر بن العزیز و سیرۃ النعمان - عالیہ کے سال سادس میں اسوۃ صحابہ از عبد السلام ندوی -

سیاسیات: عالیہ سال اول: گوکھلے کی تقریریں - سال خامس میں اصول سیاست از اجمل خاں - سال سادس و سابع میں اصول سیاسہ از لی کاک اور سال ثامن میں دستور انگلستان - علم سیاست کے اس براہ راست مطالعے کے علاوہ تاریخ قدیم و جدید کا مطالعہ بھی سیاسی معرفت مہیا کرتا ہے -

تقابل ادیان و مذاہب (مناظرہ): عالیہ سال - رابع: رشیدیہ فی المناظرہ - سال خامس میں مطالعہ عیسائیت، سال سادس میں مطالعہ ہندومت (آریہ) - سال سابع میں مطالعہ قادیانیت و اہل تشیع -

سائنسی مضامین

ریاضی: پرائمری سال اول میں گنتی لکھنا اور یاد کرنا اور دس تک پہنچاؤ - سال ثانی میں جمع، تفریق، ضرب، تقسیم بسیط - سال ثالث میں، جمع تفریق ضرب تقسیم بسیط و مرکب - ثانویہ سال اول: مقسوم علیہ اعظم و ذواضعاف اقل - سال ثانی: کسور اشاریہ و رابع متناسبہ - سال ثالث: متناسبہ و سود متی کا نا وغیرہ - سال سادس: شرح چغمینی -

سائنس: ثانویہ سال ثالث میں جدید سائنس اور سال رابع میں سائنس اور اسلام

انجینئرنگ و ڈرائنگ: ثانویہ سال اول: نقشہ نویسی اشجار، سال ثالث میں نقشہ نویسی عمارات و

مساحت - سال خامس میں مساحت و اقلیدس مقالہ اول -

فلکیات / اسٹرانومی: عالیہ سال خامس: تصریح الافلاک - سال سادس: مسامرہ شرح مسارہ

ٹیکنالوجی / دستکاری: ثانویہ سال اول، ثانی، ثالث، رابع اور خامس - عالیہ سال اول، ثانی، ثالث، رابع اور سادس - اس زمانے کی مروج دستکاریاں جیسے چرخہ چلانا اور کپڑا بنانا، حدادی (لوہے کا کام) نجاری (بڑھتی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا)، گھڑی سازی، جلد بندی، چڑا رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا اور صیانت (سونار کا کام) وغیرہ - (اصول قوانین کلیہ، رقم ۱۵)

لسانیات: زبانیں سکھانے کے معاملے میں مولانا کی پالیسی بہت ارفع ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”اس نصاب میں پانچ زبانوں کی تعلیم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بنگلہ (صوبہ کی زبان) اردو، فارسی، انگریزی، عربی مگر اوّل الذکر (بنگلہ) کو بوجہ صوبہ کی زبان ہونے کے اور آخر الذکر (عربی) کو بوجہ مذہبی اور علمی زبان ہونے کے زیادہ تر اہمیت دی گئی ہے۔ باقی ماندہ السنہ ثلاثہ (اردو، فارسی اور انگریزی) کو بقدر ضرورت لازم کیا گیا ہے۔ البتہ اردو زبان چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور علمی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل کر چکی ہے۔ پھر انگریزی چونکہ حکومت کی زبان ہے اور بہت سے وہ دنیاوی کاروبار جن سے کوئی شخص تازیت مستغنی نہیں ہو سکتا، اس سے متعلق ہیں اس لیے اس کو فارسی زبان پر فوقیت دی گئی ہے۔“ (اصول قوانین کلیہ، رقم ۹)

تبلیغ کے لیے بین الاقوامی زبانیں سیکھنے کی حمایت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ”سال ثالث سے طلباء درجہ کو زبان ہائے ذیل میں سے کوئی ایک زبان سیکھنی ہوگی: سنسکرت، برہمی، سیامی، تامل کھاسیا اوڑیا وغیرہ تاکہ بوقت ضرورت ان ملکوں میں تبلیغ کر سکیں۔“ (اصول مخصوصہ نصاب درجہ عالیہ، رقم ۴)

ذریعہ تعلیم کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ بچوں کو (پرائمری میں) حساب اور گنتی صوبہ کی (یعنی مقامی) زبان میں سکھائی جائے اور جغرافیہ اور نقشہ بھی اگر صوبہ کی زبان میں پایا جائے تو اس میں سکھایا جائے۔ پریڈ بھی اردو یا صوبہ کی زبان میں ہونا چاہیے (اصول نصاب دوم ابتدائی، ۱۵، ۱۴، ۱۰)۔ عربی علوم و فنون کے لیے البتہ وہ عربی ذریعہ تعلیم ہی کی سفارش کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”اس نصاب میں فنون کو حتی الوسع ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے البتہ عربی علوم و فنون کو مختلف مصالح کی بناء پر عربی زبان میں ہی تعلیم دینا ضروری خیال کیا گیا ہے۔ عربی زبان کے سوا اور دوسری زبانیں محض بحیثیت زبان تعلیم دی جائیں گی۔“ (اصول قوانین کلیہ، رقم ۱۸، ۱۷)۔

یہ زبانیں مولانا کس تدریج کے ساتھ اور کن کتب کے ذریعے سکھانا چاہتے ہیں، اس کی

تفصیل درج ذیل ہے:

ہنگلہ: ابتدائی سال اول: قاعدہ ہنگلہ اور ہنگلہ کی پہلی کتاب از مزمل حق و مکتب ریڈر ہنگلہ حصہ اول- سال ثانی: ہنگلہ کی تیسری کتاب و مکتب ریڈر ۲- سال ثالث: ہنگلہ کی چوتھی کتاب (سکنا پار) مصنفہ افضل النساء خاتون مع الملاء و کتابت- ثانویہ سال اول: ہنگلہ کی پانچویں کتاب (سول سہا تھا) مصنفہ قاضی عبدالحق مع تحریر- سال ثانی: سہا تھا کسوم مع تحریر از سعادت علی خان- سال ثالث: ادبیات ہنگلہ از قاضی امداد الحق- سال رابع: ادبیات ہنگلہ- عالیہ سال اول: مشق تقریر۔

فارسی: ثانویہ سال اول: فارسی کی پہلی کتاب مع دبستان دانش- سال ثانی: فارسی کی دوسری و تیسری کتاب مع تحریر و مصادر- سال ثالث: گلستان سعدی یا چوتھی کتاب فارسی- عالیہ سال اول: مشق

اردو: ابتدائی سال ثانی: اردو کی پہلی کتاب مع کتابت- سال ثالث: اردو کی دوسری و تیسری کتاب مع الملاء و کتابت- ثانویہ سال اول: قواعد اردو ۲۱ از اسماعیل میرٹھی- سال ثانی: سفینہ اردو و آئین اردو- سال ثالث: آئین اردو و مضامین الکلام- سال رابع: آئین اردو و کلام جوہر و اقبال، مشق تقریر- سال خامس: دیوان غالب

انگریزی: ثانویہ سال اول: کنگ پرائمر و فرسٹ ریڈر- سال ثانی: سیکنڈ ریڈر مع کتابت- سال ثالث: انگریزی ریڈر ۳- سال رابع: انگریزی ریڈر ۴ مع الملاء و کتابت- عالیہ سال اول: مشق تقریر

عربی (زبان، ادب اور بلاغہ): ابتدائی سال اول: قاعدہ عربی- ثانویہ سال ثالث: رسالہ علم الصرف ۲۱ از مولوی مشتاق احمد و صفوة المصادر- سال رابع: درایۃ الادب و مدارج القرآۃ، رسالہ علم الصرف و صرف میر، نحو میر و سلم الدروس العربیہ للغالبی- عالیہ سال اول: الدروس العربیہ ۳، ۴، الفیہ ابن مالک، فقہ الیمن، از ہار العرب، مجموع الادب فی فنون العرب- سال دوم: الفیہ ابن مالک و ابن عقیل، مقامات حریری- سال ثالث: دیوان مثنوی، شرح شمر قدیہ فی الاستعارات یا شرح تحفۃ الاخوان للدرودی و فتح الطیب و معانی فن اول- سال رابع: مختصر المعانی، دیوان حماسہ، المحاسن والاصداد للجاحظ، مشق تقریر- سال خامس: سبغہ معلقہ، دیوان معری- سال سادس: ادب الکتاب للصولی- سال سابع: ادب الکتاب و سال ثامن: مشق تحریر ☆

☆ تعیل میں ممکن ہے بعض کتب کا محل صحیح نہ ہو یا متعین کرنا نہ گیا ہو۔ نظر ثانی میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

دعاء مانگنا سیکھیے

س: دعا کسے کہتے ہیں؟

ج: بندے کا پورے اعتماد، کامل تذلل، پوری رغبت، خشیت اور بے بسی کے ساتھ اپنے رب کو پکارنا۔

س: حدیث شریف میں دعا کو مخ العبادۃ فرمایا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

ج: ابھی دعا کی جو تعریف عرض کی گئی ہے اسے دیکھ لیں، یہی عبادت کا جوہر ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح سمجھیں کہ عبادت نام ہے معبود کے استحضار کا۔ دعائے اللہ کو پکارنے کا عمل فطری طور پر اس استحضار کو دیگر تمام عبادات کے مقابلے میں زیادہ شدت کے ساتھ قائم کر دیتا ہے۔ دعا کرنے والا طبعاً اس کیفیت اور شعور سے معمور ہوتا ہے کہ دوسرے سرے پر اللہ ہے جو میری پکار سن رہا ہے۔ ویسے یہ بات ذہن میں رہے کہ حدیث میں دعا سے مراد محض مانگنا نہیں ہے بلکہ اللہ کو پکارنا ہے جو ذکر کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کی گئی ہے کہ اگر دعا کو محض مانگنے تک محدود کر دیا جائے تو اس میں اپنی احتیاج کا زور غالب ہوتا ہے لہذا ایسا اشتغال مخ العبادۃ نہیں کہلا سکتا۔ یہ بندگی کا خلاصہ تو ہو سکتا ہے کہ بندگی احتیاج ہی کا دوسرا نام ہے لیکن عبادت کا نہیں۔ عبادت کا جوہر اللہ کی یاد کا مکمل غلبہ ہے۔ تو اب ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دعا اللہ کو پکارنے کا عمل ہے جس میں مانگنا بھی شامل ہے۔

اس حدیث مبارکہ کی ایک شرح یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بندے کے لئے اللہ کا حضور اس کی ربوبیت، رحمت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ تمام اوصاف اللہ کو مخاطب کرنے کا جو اسلوب ہماری فطرت میں تشکیل دیتے ہیں وہ عبادت اور استعانت سے مل کر بنا ہے یعنی اللہ کی وہ صفات جو بندے کے اندر اس کی یاد اور تعلق کا سبب بنتی ہیں، عبادت اور استعانت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ دعا عبادت اور استعانت ہی سے مرکب ہے یعنی کل بندگی اور تمام اوضاع بندگی کا جوہر ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے دعا کا یہ مطلب ارشاد فرما کر ہمیں یہ بتایا ہے کہ دعا اصول عبادت، شان معبودیت اور حقیقت بندگی کی معرفت ہے۔ دعا میں یہ معرفت حسی درجے پر میسر آ جاتی ہے جس سے بڑھ کر کمال کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

زیادہ عام فہم انداز میں سمجھنا ہو تو مندرجہ ذیل نکات توجہ سے دیکھ لیں:

۱۔ عبادت کا جوہر اللہ کی معبودیت اور اپنی بندگی کو حاضر رکھنا ہے

۲۔ معبودیت کا دھیان کرتے ہوئے یہ اوصاف خود بخود یاد آ جاتے ہیں:

- الوہیت - ربوبیت - رحمت - یوم آخرت کی بادشاہی
۳۔ بندگی کا پورا دھیان یہ ہے کہ اپنی دو چیزیں بالکل زندہ حالت میں محسوس ہوں: عبادت یعنی اللہ کے آگے جھکنا اور استعانت یعنی اللہ کو پکارنا۔ دعا میں عبادت اور استعانت دونوں یکجا ہو جاتی ہیں۔ ان نکات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبادت کا سب سے کامل اور انتہائی حال یعنی بندگی اور معبودیت کا بیک وقت استحصال، دعا میں طبعی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی وصف کی بناء پر اسے عبادت کا مغز فرمایا گیا ہے۔

ذوقی انداز سے کہیں تو دعا مکمل بندگی کی علامت ہے یا بندگی کی حقیقت کا کامل اظہار ہے۔ دعا کے وقت یہ بات قلب و ذہن میں رہنی چاہیے کہ میں پورا پورا کلمات دعا میں سما کر اپنے رب کے حضور میں پیش ہو رہا ہوں۔ پھر چاہے آدمی چھوٹی چیز مانگے یا بڑی، اعلیٰ درجے کی شکرے یا اپنی حیثیت کے مطابق معمول کی حمد میں مشغول رہے، اس کی تاثیر نفس میں حقیقت بندگی کا ایک ذائقہ پیدا کر دے گی جو احتیاط اور استقامت کے ساتھ برقرار رکھا جائے تو ذکر دوام اور احسان بن جاتا ہے۔ جو آدمی اس کے آداب کے ساتھ اسے نبھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ مقربین کے طبقے میں جگہ پاتا ہے کیونکہ دعا سے زیادہ حاصل قرب کوئی اور چیز نہیں ہے جیسا کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ ۲: ۱۸۶)

”(اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دو کہ میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔“
س: یوں محسوس ہوتا ہے کہ دیگر عبادات کے مقابلے میں دعا میں بندے کی شمولیت زیادہ ہوتی ہے۔ شمولیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ دعا کا عمل انسان کے بڑے حصے کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اور اگر یہ بات درست ہے تو کیا اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بندگی کی مخصوص نفسیات کی تعمیر میں دعا کا ایک بہت بڑا اور مرکزی کردار ہے؟

ج: یہ دونوں باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔ دعا نفس کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے اور بدلنے کی قوت اور تاثیر رکھتی ہے لہذا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ بندے کو جس نفسیاتی معیار اور صحت کا حامل ہونا چاہیے، اس کا حصول دعا میں رسوخ پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں۔ دعا میں بندے کو اپنی حقیقت اور ضرورت کا خود بخود جتنا احساس رہتا ہے وہ عبادت کی دوسری اقسام میں مشکل ہے۔ دعا ایک طرح سے بندگی کی اس روح کا اظہار ہے جو ذکر اور استعانت سے عبادت ہے۔ اللہ کی یاد اور اپنی

محتاجی کا سچا احساس اگر ایک ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں جو چیزیں بھی حاصل ہوتی ہیں، ان میں ایک وصف ضرور پایا جائے گا اور وہ ہے جس تعلق کی تسکین۔ اس نکتے کی طرف ہم بعد میں آئیں گے کہ یہ جس تعلق کیا ہے اور اس کی تسکین سے کیا مراد ہے؟ سر دست اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ احتیاج انسانی نفس کے لیے بندگی کا سب سے ٹھوس اور محکم تجربہ ہے جو اثر اندازی کے معاملے میں باقی چیزوں سے بہت آگے ہے یعنی بندگی پورے انسانی پن کے ساتھ جس شعور اور کیفیت میں سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے وہ یہی احتیاج ہے۔ اس کا شعور کبھی ماند نہیں پڑتا اور اس کا احساس شدید اور گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی بھی ہے۔ اصول کی بات ہے کہ جو چیز شعور اور احساس دونوں میں شدت، گہرائی اور دوام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ ذہن سے لے کر طبیعت تک کے تمام مراحل میں حاضر اور برقرار رہتی ہے۔

یہاں ذرا سارک کر یہ دیکھ لینا بہتر ہوگا کہ نفس کے مقاصد، چاہے اچھے ہوں یا برے، اس وقت تک ہاتھ نہیں آتے اور نفس پر ان کے اثرات پوری طرح مرتب نہیں ہوتے جب تک نفس اپنی تمام قوتوں اور مدارج کے ساتھ ان کی طرف یکسو نہ ہو جائے اور اس یکسوئی کے حصول میں کامیابی ممکن نہیں ہے جب تک کہ نفس کے اندر اپنے مقصود کا استحضار اور اپنی ضرورت کا شعور و احساس پوری طرح سے کار فرما نہ ہو۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ نفس کی سب سے بڑی قوت یکسوئی ہے۔ یکسوئی کے لئے چند چیزیں لازماً درکار ہیں:

۱۔ مقصود کا ہونا

۲۔ مقصود کے حصول کی طلب اور اس حصول کے ذرائع کا علم

۳۔ مقصود کا استحضار ۴۔ مقصود پر انحصار

۵۔ اپنے نقائص، مجبوریوں اور ضرورتوں کا ادراک جن کی تکمیل مقصود کی طرف سے ہوتی ہے۔

اس اصول اور اس کے مذکورہ بالا اجزاء کو شرعی پس منظر میں اس طرح بیان کیا جائے گا کہ نفس کو بندگی کے سانچے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ عبادت اور اسعانت۔ عبادت میں شعور بندگی کا کار فرما ہوتا ہے جس سے نفس کا ہدف متعین ہو جاتا ہے اور استعانت احساس بندگی سے عبارت ہے جس میں نفس کی فعلیت کا مرکز درست رہتا ہے۔ احساس بندگی میں وفور پیدا ہوئے بغیر نفس کی پوری ساخت تبدیلی کے عمل سے نہیں گزرتی یعنی محض شعور نفس کو اول سے آخر تک بدلنے کے لئے کافی نہیں ہے تا وقتیکہ احساس کی کمک بھی حاصل نہ ہو جائے کیونکہ نفس اپنی ماہیت میں ذہن کے مقابلے میں جس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کا بنیادی وظیفہ حق و ناحق یا صحیح و غلط کی تمیز نہیں ہے بلکہ پسندیدہ و ناپسندیدہ کی تفریق ہے۔ رغبت و کراہت کی سطح تک اترے بغیر کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی نفس کو اندر سے

منقلب نہیں کر سکتی مثلاً حق کا شعور اور صحیح بات کا علم نفس کی تبدیلی کے حدود متعین کرتے ہیں لیکن اگر نفس ان کی طرف راغب نہ ہو سکے تو تبدیلی اور تزکیہ کا عمل مطلوبہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس تناظر میں دیکھیں تو واضح طور پر نظر آجائے گا کہ نفس میں عبادت کی تاثیر اس احساس محتاجی پر موقوف ہے جس کو شعور کی بھی تائید حاصل ہو۔ یہی استعانت کا منبع ہے جو دراصل نفس کا حقیقی اسلوب عبادت ہے۔

بات یہی ہے مگر دوسرے رخ سے بھی جا رہی ہے کہ نفس تسکین کا جو یا ہے، اچھے معنی میں بھی اور برے معنی میں بھی --- بالکل اسی طرح جیسے آنکھ دیکھنے پر مجبور ہے یا کان سننے پر معمور ہے۔ یہ طلب تسکین، ظاہر ہے کہ احتیاج پر مبنی ہے یعنی نفس سراپا احتیاج ہے اور چیزوں کے ساتھ اس کا جو بھی تعلق ہے وہ رفع احتیاج کے پہلو سے ہے --- رفع احتیاج یعنی تسکین۔ اب دیکھیے کہ دعا نفس کی خلقت اصلی سے کس قدر مناسبت رکھتی ہے۔ یہ بندگی کو احتیاج بنادیتی ہے اور احتیاج کو بندگی، یعنی نفس کو کسی اہانت یا احساس شکست میں مبتلا کیے بغیر اس کے بنیادی داعیے کو محض مقاصد کا درست تعین کر کے اس کی تبدیلی کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ دعا میں تسکین وہی کا عنصر یوں بھی بحد کمال ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص تاثیر یہ بھی ہے کہ یہ احتیاج کو اس کی تمام تر شدت قائم رکھتے ہوئے بالکل بدل دیتی ہے۔ نفس کے تزکیہ و تبدیلی کی سب سے موثر اور فطری صورت یہی تو ہے کہ اس کا اصل سرمایہ یعنی احساس ضرورت برقرار رہے اور ضرورت بدل جائے۔ طلب، تمنا، رغبت یہ چیزیں وہی رہتی ہیں مگر ہدف کی تبدیلی سے زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ نفس کا دوسرا خلقی تقاضا یہ ہے کہ یہ خود کو اوجھل نہیں کرنا چاہتا۔ اسے خود فراموشی کسی بھی قیمت پر قبول نہیں۔ دعا میں اس تقاضے کا لحاظ بھی پایا جاتا ہے اور اس کی درست سمت میں کارفرمائی کا سامان بھی۔ کیا یہ بات ہم سب کے تجربے میں نہیں ہے کہ دیگر عبادات میں اللہ کا دھیان غالب رہنا چاہیے اور اپنا شعور مغلوب جبکہ دعا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دعا میں اپنا شعور بھی پوری قوت کے ساتھ موجود رہتا ہے بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خود شعوری کی جو سطح دعا میں میسر آتی ہے وہ زندگی کے کسی اور مرحلے پر حاصل نہیں ہوتی۔ بندہ خود پر جتنا دعا میں کھلتا ہے اتنا کسی اور موقع پر نہیں کھلتا۔ اس جہت سے بھی دعا نفس کو بندگی کے رنگ میں رنگنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

نفس کی تیسری بڑی ضرورت اپنا تحفظ ہے۔ یہ تحفظ کے احساس میں رہنا چاہتا ہے جب اپنے چاروں طرف موجود دنیا میں اپنی حفاظت کا یقینی بدو بست نہیں دیکھتا تو اپنے طور پر اس کا سامان کرنے لگتا ہے، کبھی سرکش بنا کر، کبھی جو یائے لذات بن کر اور کبھی ہر طرف سے غافل ہو کر۔ دوسری طرف تحفظ کی فراہمی دعا کے لوازم میں سے ہے اور چونکہ دعا خود ایک مرکز یقین ہے لہذا تحفظ کی ہر صورت شعور اور احساس دونوں دائروں میں ایک تعین حاصل کر لیتی ہے۔ (جاری ہے)

سائنس مخالفین کی فکری بنیادیں

پاکستان میں سائنس مخالف مکتبہ فکر کے ایک نمائندہ اور جوہری مضمون کے تنقیدی جائزہ اور تردید پر مبنی راقم کا مضمون ”سائنس کی مخالفت کے جواب میں“ جون ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ البرہان اکتوبر کے شمارے میں اس مضمون کا مرکزی خیال ان الفاظ میں شائع ہوا:

”مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کی مخالفت اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دینا مسلمانوں کو سائنس و ٹیکنالوجی سے محروم رکھنے کی ایک ’سازش‘ ہے۔“ (البرہان، اکتوبر ۲۰۱۲ء)

اپنے موقف کی ترجمانی میں راقم کو ”مغربی سائنس و ٹیکنالوجی“ اور ”سازش“ کے الفاظ پڑھ کر اچھی خاصی خفت محسوس ہوئی۔ راقم کو محسوس ہوا کہ شاید اس نے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ابلاغ و تفہیم کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں کوتاہی برتی ہے۔ اس تناظر میں تنقیدی نکتہ نگاہ سے اپنا مضمون دوبارہ پڑھا۔ دوبارہ مطالعہ کے بعد اطمینان ہوا کہ اپنے مدعا کی تفہیم و ابلاغ میں ہم نے مذکورہ بالا دونوں الفاظ استعمال نہیں کیے۔ تاہم اس کرب سے ہم ضرور دوچار ہوئے کہ مقدور بھر کوشش کے باوجود ہم اپنے مدعا کے ابلاغ میں کامیاب کیوں نہیں ہو پائے۔ ذیل کی سطور راقم کے اسی کرب کا شاید جواب ہیں۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے یہاں اپنے مضمون کے مرکزی نکتہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ راقم نے تحریر کیا تھا کہ:

۱۔ ”مغرب کے دجالی ذہن نے ”سائنس“ پر خدا پیڑاری اور مذہب دشمنی کا پردہ ڈال کر درحقیقت انسانیت کو سائنس کے حقیقی فوائد سے محروم کرنے اور اپنے ابلیسی مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔“ (سائنس کی مخالفت کے جواب میں، ص ۳۹، البرہان، جون ۲۰۱۲ء)

۲۔ سائنس کے مختلف میدان ہائے کار مثلاً حساب، لوہے کی صنعت، زیور و سکہ سازی، زراعت و آبپاشی، وٹرنری، طب، ذرائع رسل و رسائل، مواصلات، جیولوجی اور دفاع کی سائنسز کا ذکر کرتے

ہوئے راقم نے تحریر کیا تھا کہ:

”درج بالا تمام تقاضے اور ضروریات سائنس اور سائنسی ترقی کو وجود میں لانے کا بنیادی سبب ہیں۔ اگر انسانی جبلت کے یہ تمام تقاضے اور ضرورتیں خدا اور وحی کے انکار کے ہم معنی ہیں تو پھر یقیناً ”سائنس“ کفر ہے..... یہی چیز درحقیقت سائنس کی اصل اور اس کا جوہر ہے۔“ (سائنس کی مخالفت کے جواب میں، ص ۴۰، البرہان، جون ۲۰۱۲ء)

مضمون کا مرکزی خیال: ہم اپنے مضمون کا مرکزی خیال درج ذیل الفاظ میں بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

”مغرب کے دجالی ذہن نے ”سائنس“ پر خدا پیڑاری اور مذہب دشمنی کا پردہ ڈال کر درحقیقت انسانیت کو سائنس کے حقیقی فوائد سے محروم کرنے اور اپنے ابلیسی مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سائنس کو خدا اور معبود کے مقام پر لا بٹھانا ایک قسم کی انتہا پسندی تھی تو اس کو اسلام اور انسانیت کا دشمن ثابت کرنا دوسری قسم کی انتہا پسندی ہے۔ لہذا مسلمانوں میں سے جو اہل علم اسلام اور سائنس کو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اسلام اور انسانیت کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ لاشعوری طور پر مغرب کے ابلیسی پروگرام کو پھیلانے اور اس کی تائید و تقویت کا باعث بن رہے ہیں۔“

سائنس مخالف سوچ کی فکری بنیادیں: ان تمہیدی سطور کے ساتھ ہم عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اسلام اور سائنس میں محاربت و مخالفت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کی تمام تر کاوشوں کا مقصود مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ اور گروہ پیدا کرنا ہے جو منطقی و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر اور مغربی فلاسفہ کی نام نہاد سائنسزم کو بنیاد بنا کر اسلام کو سائنس و ٹیکنالوجی کا بدترین مخالف ثابت کرے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے یہ حضرات سائنس و ٹیکنالوجی کے منفی استعمالات اور مغربی تمدن و مادہ پرستانہ فلاسفہ کی فکر کو Scientism کے عنوان سے سائنس کے خلاف سب سے مضبوط ترین دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مکتب فکر کی دوسری کوئی ٹھوس فکری بنیاد نظر نہیں آتی۔

چنانچہ اپنے اس طریق واردات میں یہ حضرات جدید دور کے ہر اس محترم داعی، مفکر، عالم دین اور سلیم الفطرت و متوازن الفکر قابل ذکر شخصیت کی تحقیر و تردید اور تمسخر اڑانا ضروری خیال کرتے ہیں، جن کے افکار و تحریروں سے ان کے اس انتہا پسندانہ اور غالی فکر کے عدم توازن اور عدم سلامتی کو واضح کیا جاسکتا

ہے۔ اسی لیے یہ مکتب فکر سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے لے کر سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور تک علامہ محمد اقبال سے لے کر ڈاکٹر رفیع الدین تک کو اور ڈاکٹر محمود احمد غازی سے لے کر ہر اس قابل ذکر عالم دین پر طعن اور تردید کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں جن کی تحریریں ان کے اس ”غالی فکر“ کی حمایت کی بجائے تردید کا باعث بن سکتی ہیں۔

یہ مکتب فکر اپنی فکری بنیادوں کی تعمیر کے لیے مغربی فلاسفہ اور مغربی مفکرین کی تحریروں، کتابوں اور مقالوں کے اکثر و بیشتر محض ناموں کو سند اور برہان قاطع کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کتابیں اور مقالہ جات نہیں پڑھے ہم نے ان کے کسی سوال اور اعتراض کا کوئی جواب نہیں دینا۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس طرز عمل سے یہ حضرات اپنے نظریہ کی فکری بنیادوں اور اصل مآخذ و سرچشمہ کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ قابل تعجب مقام یہ ہے کہ ان حضرات کی فکر اور تحریروں کے نتیجے میں ایک قاری مخاطب تو ان حضرات سے ہونا چاہتا ہے لیکن یہ اپنے مخاطب کو پکڑ کر مغربی فلاسفہ کی خدمت میں لے جاتے ہیں اور قاری سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی سائنس کی وہی تعریف درست مان لے جس کا اعلان و اظہار مغرب کے یہ حلقہ اپنی فاسد اور ایمان سے عاری سوچ کی بنیاد پر اور اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم بصد احترام عرض کریں گے کہ اگر ہم نے مغربی فلاسفہ سے یا ان کے کسی پیروکار سے ہمکلام ہونا ہوتا تو ہم یقیناً ان کی کتب کا مطالعہ کرتے۔ لیکن ہم تو جناب خالد جامعی اور زاہد صدیق مغل صاحب سے مخاطب ہیں اور ان سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم صرف انہی کے افکار اور تحریروں کا مطالعہ کر لیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ زیر بحث مکتب فکر سے مکالمہ کے لیے سائنس کے ان مغربی قبضہ گروپ فلاسفہ کا حوالہ دے کر ان کو پڑھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جنہوں نے ہر دور میں سائنس پر جھوٹ، تلخیص اور دجالیت کی ملمع سازی کرنے کی کوشش کی۔ وہ مغربی فلاسفہ جن کے بارے میں اور یا مقبول جان لکھتے ہیں کہ ”سائنس میں کوپرنیکس، نیوٹن اور ڈالٹن کے نظریات کو آئن سٹائن نے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے اور کہا کہ تم سائنس کے نام پر تین سو سال تک جھوٹ پڑھاتے رہے ہو“۔ کیا ان فلاسفہ کے جھوٹ کو پڑھنا ضروری ہے جو کئی دہائیوں تک ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو ثابت شدہ سائنسی حقیقت اور مغرب کے متفق علیہ عقیدہ کے طور پر پڑھاتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اکیسویں صدی کے اواخر میں ارتقاء کی یہ تھیوری محض فراڈ اور دھوکہ ثابت ہوئی۔ اور خود سائنس دانوں ہی نے اس خود ساختہ مفروضہ کی دجالیت کا پردہ چاک کیا ہے۔

خالد جامعی صاحب کی چند خصوصیات: زیر بحث مکتب فکر کے موجودہ فکری قائد خالد جامعی صاحب ایک

عالم و فاضل شخصیت ہیں اور ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے لیکن موضوع زیر بحث کے حوالے سے ان کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو نوٹ کرنے کے قابل ہیں:

(۱) اپنی فکر کی ترویج کے لیے جو رسالہ (ساحل) وہ شائع کرتے رہے ہیں اس کی تحریر کا (Font) سائز انہوں نے اتنا چھوٹا رکھا ہے کہ ایک نارمل انسان کے لیے اس کا پڑھنا ہی بے حد تکلیف اور زحمت کا باعث بنتا ہے۔ غالباً سائنس کی ضد میں وہ انسان کو اپنے تئیں جو ”راست فکر“ دینا چاہتے ہیں اس کے ابلاغ میں بھی وہ اپنے مخاطب کو مصنوعی طور پر تکلیف اور زحمت کے مراحل سے گزارنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۲) اپنے مخاطبین اور قارئین کو تکلیف پہنچانے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جناب جامعی صاحب بلا مکان، بلا توقف اور بلا تخصیص لکھتے چلے جاتے ہیں۔ قاری کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کون سے پیرے یا کون سے صفحے کے کس مقام پر وہ اپنے کون سے دعویٰ کی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ قاری کو ان کی تحریروں میں دعویٰ (مفروضہ) اور پھر اس کے بعد آنکھوں اور دماغ کو تھکا دینے والے اور نہ ختم ہونے والے متعلق و غیر متعلق مواد کا بے ربط و بے ترتیب ہجوم ملتا ہے۔ مواد کے اس بے ترتیب ہجوم میں وہ مغربی فلاسفہ و حکماء (شیخ احمد سرہندیؒ کے الفاظ میں حمقاء) کی کتابوں اور مقالہ جات کے ناموں کا رعب کچھ اس طرح سے قاری پر ڈالتے ہیں کہ ایک سادہ دل اور عام فہم قاری یا تو بغیر کسی دلیل اور بحث کے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے اور یا پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

(۳) جناب جامعی صاحب کے لیے معقول طریقہ تو یہ تھا کہ جن جن فلاسفہ کی تحریروں سے وہ اپنی فکری بنیادیں استوار کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں بیان کیے جانے والے دلائل کو وہ بحث کے لیے پیش کرتے۔ نتیجتاً اگر تو یہ دلائل اپنے دعویٰ کو ثابت کر دیتے تو ایک قاری کے لیے علی وجہ البصیرت ان کا ہمنوا بننا بہت آسان ہو جاتا۔ بصورت دیگر دعویٰ اور دلیل میں ہم آہنگی ثابت نہ ہونے کی صورت میں نہ صرف مغربی فلاسفہ بلکہ جامعی صاحب کے موقف کا رد کرنا ایک قاری کے لیے بے حد آسان ہو جاتا۔

تاہم موجودہ صورت میں ہم نہایت دیانتداری سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ”اسلام اور سائنس کی باہمی ضد، مخالفت، عناد اور عداوت“ پر مبنی فلسفہ اور فکر تو ازن اور سلامتی سے عاری ہے۔ یہ ایک غالی فکر ہے جو بظاہر اسلام سے محبت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے لیکن اپنے نتیجہ کے طور پر یہ فکر اسلام کے بدترین مخالفوں، عالمی استعمار اور ابلیسی مقاصد کو زبردست معاونت، سپورٹ اور خدمات فراہم کر رہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس فکر کے آغاز میں کوئی مثبت جذبہ اور اچھی سوچ کا فرما ہو لیکن جب یہ فکر اعتدال

اور توازن کی حدود عبور کر جاتی ہے تو اپنی ہی قائم کی ہوئی حدود اور معیار کو پامال کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے، بالکل ان لوگوں کی طرح جن کے بارے میں قرآن حکیم نے یہ فرمایا ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ

رعايتها.....﴾ (الحديد ۵۷: ۲۷)

”اور رہبانیت (لذت سے کنارہ کشی) تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی تھی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے اپنے خیال میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (آپ ہی ایسا کر لیا تھا) پھر جیسا اس کو نباہنا چاہیے تھا نباہ بھی نہ سکے۔“

عقل، علم اور مال و دولت کی جدید شکل..... سائنس: راقم کی نہایت طالب علمانہ رائے میں اسلام اور قرآن کے وہ تمام احکامات ”سائنس“ پر بھی لاگو ہوتے ہیں جو ”عقل، علم اور مال و دولت“ کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے سائنس دراصل ”عقل، علم اور مال و دولت“ ہی کی ایک جدید ترین شکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں صدیوں پہلے انسانی معاشروں میں جو اہمیت اور جو مقام و مرتبہ ”عقل، علم اور مال و دولت“ کو حاصل ہوا کرتا تھا، جدید دور میں وہی مقام و مرتبہ ”سائنس اور ٹیکنالوجی“ کو حاصل ہو گیا ہے۔ اس تناظر میں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ”عقل، علم اور مال و دولت“ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، عطا اور آزمائش ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اس لیے دی ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور خزانے کو انسانیت کی فلاح، اصلاح اور بہتری کے لیے استعمال کرے۔ لیکن صدیوں پر محیط تجربات ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہر دور میں ”عقل، علم اور مال و دولت“ کے بل بوتے پر بجائے خدا کے آگے سر بسجود ہونے کے خود ہی خدا بن بیٹھا ہے اور بجائے انسانیت کا سچا ہمدرد و عنخوار بننے کے انسانیت کو دکھوں اور محرومیوں کے جہنم کی آخری حدوں کی طرف دھکیلنے میں لگن رہا ہے۔ اس نے اللہ کی دی ہوئی اس بیش بہا طاقت اور خزانے کو اپنی شیطانی سوچ کو مسلط کرنے، اپنی انانیت و ابلیسیت کو منوانے اور انسانیت پر ظلم و استیصال، فساد، خون خرابے اور بستیوں و کھیتیوں کو اجاڑنے کے لیے بے دریغ استعمال کیا لیکن ”عقل، علم اور مال و دولت“ کے خلاف ان واضح شواہد و تجربات کے باوجود اسلام اور قرآن نے اسے خدا، مذہب، وحی اور انسانی زندگی کی ضد قرار دے کر انسان کے لیے مضر، مہلک اور ممنوع ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس انسان کی حیرت و استعجاب کی اس وقت کوئی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ (اسلام، قرآن اور سیرت رحمت اللعالمین ﷺ) کے ذریعے انسانی معاشرے کی تشکیل و فلاح کے لیے ”عقل، علم اور مال

ودولت“ کے ناگزیر استعمال کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس بیش بہا نعمت کے درست استعمال، اسے محرومین و مستحقین میں بانٹنے اور اس کے ذریعے معاشرے کی فلاح و بہبود کے کام کو ایک بہت بڑی نیکی، عبادت اور فریضہ قرار دیتا ہے۔

مشیت اور شریعت کا فرق: اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو ہمیشہ ”عقل، علم اور مال و دولت“ (مادی و سائنسی ٹیکنالوجی کی طاقت) کے پہلو سے اپنے عہد کی قوموں کے مقابلہ میں وسائل و ٹیکنالوجی میں غیر معمولی حد تک کمزور اور کمتر ہونے کے باوجود اپنے دین کو غالب کرتا رہا ہے۔ شاید آخری دور میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ دین اسلام کو اپنی اسی سنت کے مطابق پوری دنیا پر غالب کر کے دکھائیں گے۔ تاہم واضح رہے کہ یہ حکمت و مشیت ربانی اور ارادہ الہی کے دائرہ کا معاملہ ہے نہ کہ شریعت کا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سپریم ہے وہ مادہ و سائنس کا محتاج نہیں ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، وہ ہر چیز سے وراء الراء ہے۔ صرف اسے ہی اپنا کبر، بڑائی اور طاقت منوانے کا حق حاصل ہے۔ لہذا وہ نہایت کم مادی وسائل کے حامل اپنے سچے ماننے والوں سے کافروں کو مادی پہلو سے بے حد زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود غیر تاک شکست سے دوچار کرتا رہا ہے جب کہ اس کے برعکس انسان تو ہے ہی سراپا احتیاج، وسائل و ذرائع اور حواس و ماحول میں گھرا ہوا۔ لہذا شریعت نے انسان کی ان ناگزیر مجبوریوں اور ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر معتدل ترین، متوازن ترین اور بہترین و حسین ترین عملی ہدایت شریعت کی شکل میں دی ہیں۔ انسان کو شریعت کا پابند کیا گیا ہے اور انسان کو یہ حق بالکل نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت کی حدود سے نکل کر سنت اللہ اور اختیار خداوندی کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرے کیونکہ ایک کمزور و ناتواں مخلوق کے لیے یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہمسری کرنے کی کوشش ہے۔ انسان کو صرف اس کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ دستیاب ”عقل، علم اور دولت“ (آج کی اصطلاح میں سائنس و ٹیکنالوجی) کی بہترین منصوبہ بندی کرتے ہوئے اور اس کا بہترین استعمال کرتے ہوئے اللہ کی خوشنودی (بندگی رب اور صلاح و فلاح انسانیت کے مقصد) کو حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرے جب کہ نتیجہ کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس کے حضور اپنے عجز اور بے طاقتی کا والہانہ اظہار کرے۔ یعنی مادی طاقت اور عقلی منصوبہ بندی کے مقدور بھر استعمال کے باوجود نتائج کے حصول کے لیے ان سب مادی اسباب سے ذہناً اور قلباً ہٹ کٹ کر خالصتاً اللہ تعالیٰ کی فیہی طاقت کے حصول کے لیے والہانہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے اور رجوع و انابت کی شکل میں اس کا دامن مضبوطی سے تھامے رہے۔ اس تناظر میں سائنس و ٹیکنالوجی کو کفر ثابت کرنا اور اسے اسلامی زندگی سے نکال باہر پھینکنے کی دعوت دینا ایک نہایت اجنبی اور اسلام کی تائید سے محروم دعوت محسوس ہوتی ہے۔ قرآنی دلائل اور روشنی سے محروم یہ ایک

سلبی، غالی اور بے برکت فکر ہے، جو اسلام کا نقصان کرنے، انسانیت کو بھٹکانے اور ابلیس کی مقصد برآری میں تو کام آسکتی ہے، اس سے کوئی خیر کا کام نہیں لیا جاسکتا۔

رہبانیت کی طرف سفر: زیر بحث فکر اپنے نتیجے کے اعتبار سے اسلام کو زندگی کے عملی میدانوں سے نکال کر اسے محض مسجد و خانقاہ کے کونے کھدروں میں چھپنے پر مجبور کر دیتی ہے اور پھر مسجد و خانقاہ میں بھی یہ اپنے بیان کیے ہوئے معیارات و اصولوں کی پاسداری نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مسجد و خانقاہ میں بھی یہ ”عقل، علم اور مال و دولت“ کی جدید شکل یعنی سائنس و ٹیکنالوجی کی مصنوعات کا بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ ہمیں عرض کرنے دیجیے کہ زیر بحث کتب فکر درحقیقت رہبانیت ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ وہی رہبانیت جس نے مشرق و مغرب میں کلیسائی جبر کو خوب کھل کر کھیلنے کے مواقع دیے۔ زیر بحث فکر اپنے نتیجے کے اعتبار سے مذہب / اسلام کو زندگی کے عملی میدانوں سے نکال باہر کرتی ہے اور اس طرح مذہب کی ناکامی کا چوٹ دروازہ کھول دیتی ہے۔

سائنس کے ساتھ متوازن رویہ: اس مقام پر ہم یہ وضاحت کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سائنس کے بہیمانہ، اندھا دھند اور غیر متوازن استعمال پر تنقید کرے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ ہمارے با افراط تنوع و استغراق کے نقصانات سے ہمیں آگاہ کرے کہ اس طرز عمل نے ہمیں درجنوں مسائل و مشکلات سے دوچار کر دیا ہے اور ہمیں ایک روحانی تعذیب میں مبتلا کر دیا ہے چنانچہ اس مشکل اور غیر متوازن صورت حال سے نکلنے کے لیے وہ سائنس اور اس کی مصنوعات کے استعمال کو کم کرنے کی دعوت دے، تاکہ افراط پر مبنی رویوں کو دوبارہ توازن اور اعتدال پر لایا جاسکے تو ایسا شخص افراد اور معاشرے کا محسن ہے اور وہ ان کا بھلا چاہتا ہے لہذا اس کی حمایت کرنا عقل و دین دونوں کا تقاضا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی آواز درحقیقت سنجیدہ اصلاح کی ایک قابل تحسین آواز ہے لیکن اگر کوئی شخص سائنس کے غیر متوازن و بہیمانہ استعمال اور کسی خاص علاقے اور عہد کے چند شیاطین (مغربی فلاسفہ) کی طرف سے سائنس کے انوکھ بنیاد بنا کر سائنس و ٹیکنالوجی کو مذہب دشمن اور کفر و الحاد قرار دے کر اسے قابل رد ہونے کا اعلان کرے تو ایسا شخص ایک مہلک بیماری (دنیا پرستی) کا جو علاج تجویز کر رہا ہے وہ ایک اور مہلک بیماری (رہبانیت) کو جنم دینے کا باعث بن رہا ہے۔

زندگی اپنا سفر روکا نہیں کرتی: زندگی کے اس سفر میں انسان کے بہترین فطری معاون ”انسانی سوچ و کاوش“ اپنا وظیفہ ادا کرنا کسی حال میں ترک نہیں کرتے۔ اب حاملان قرآن کا فرض یہ ہے کہ وہ زندگی اور اس کے اہم ترین معاونات ”سوچ و کاوش“ کو رہنمائی اور روشنی عطا کریں تاکہ اس سفر کی سمت درست

رہے اور انسانی ”سوچ و کاوش“ کا وظیفہ درست طور پر انجام پاتا رہے۔

حیات انسانی کی ایک ناگزیر رفیق و معاون: اکثر ایسا ہوتا رہا ہے اور جدید دنیا میں بھی تاریخ نے اپنی اس روایت کو دہرایا ہے کہ انسانی مسائل کے حل کے لیے وقوع پذیر ہونے والی ”سوچ و کاوش“ (سائنس) نے مذہبی طبقہ کے بانجھ پن، رہنمائی اور قیادت کی صلاحیت کے فقدان اور مذہب کی غیر معقول، منہج شدہ اور منحرف شدہ تعبیرات اور اس تعبیر کے جبر و تشدد پر مبنی اطلاق کے رد عمل میں مذہب کا قلابہ ہی اپنی گردن سے اتار کر پرے پھینک دیا۔ اس کے نتیجے میں نوع انسانی جن شدید اور نہ ختم ہونے والے مصائب و آلام سے دوچار ہوتی ہے اس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں اس مجرم مذہبی طبقہ اور ان کے ناخلف پیروکاروں کو دیتا رہا ہے جو انسانی ”سوچ و کاوش“ یا ”عقل + علم + دولت“ (عصر حاضر کی زبان میں سائنس و ٹیکنالوجی) کو خالص آسمانی ہدایت، رہنمائی اور روشنی عطا کرنے میں مجرمانہ غفلت ہی نہیں برتتا بلکہ آسمانی ہدایت کی منہج شدہ، منحرف شدہ اور غلو پر مبنی تعبیرات کی تلوار لے کر انسانی زندگی کے سفر کے اس ناگزیر اور اہم ترین زاد راہ اور متاع کو چھیننے اور اس کے آگے سد راہ بننے کی کوشش کرتا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کا سفر جاری رہنا ناممکن ہے۔

سائنسزم..... ناکامی کی شاہراہ پر: چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری میں جب پوری دنیا میں مسلمانوں کے اقتدار اور علم کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن اپنے عین عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے انسانی سوچ و کاوش (سائنس) کی روحانی رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور دنیا کے مڑوں اور اقتدار میں غافل ہو گئے۔ واضح رہے کہ خالص مادی و دنیوی معاملات میں ”سائنس“ کی رہنمائی یہ ہے کہ اس کا استعمال انسانی فائدے کے لیے ہو اور اس کو شرک و ضرر سے پاک رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ اس بنیادی نگہبانی کے ساتھ اس کے آزادانہ نشوونما کے ماحول کو تحفظ دیا جائے۔ یہی وہ دور غفلت تھا جب شیطان نے انسان کی سوچ و کاوش ”عقل + علم + دولت“ (سائنس) کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ شیطان اپنے اس منصوبے میں کامیاب رہا۔ لہذا اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف چار سو سال سے سائنس کا علمبردار مغربی دانشور سائنس اور مذہب کی دشمنی کا اعلان کر رہا ہے بلکہ عین اکیسویں صدی میں جب کہ مغرب کا دانشور سائنس کی مذہب دشمنی کے نظریہ کے مہلک ترین نتائج اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا ہے اور اس سے تاب نہ ہونے کے لیے بالقوہ اسلام کے دروازہ پر پہنچ چکا ہے، پاکستان میں ایک طبقہ علم و مذہب کا جھنڈا تھامے انسانی زندگی کے سفر کے ناگزیر اور بہترین معاونات (سائنس و ٹیکنالوجی) کو اسلام کی ضد اور اسلام کا بدترین مخالف ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں نکلتا کہ (۱) مغرب کے جس انسان نے زندگی کے سفر کے بہترین معاونات ”سوچ و کاوش“ (سائنس) کا

راستہ روکنے پر اپنے محبوب ترین مذہب کو اتار کر پرے پھینک دیا تھا وہ آج چار پانچ صدیوں کی صحرا نوردی کے بعد جب ایک بار پھر اپنی حقیقی معبود کے آگے سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے اور شرک کے غیر علمی عقیدے سے پاک مذہب کی آغوش میں آنے کے لیے بے تاب ہے، طبعاً و عقلاً وہ اسلام کے بے حد قریب آ گیا ہے، اسلام کے نادان دوست اسلام کی مسخ شدہ اور رہبانیت پر مبنی تعبیر کے ساتھ اس کے راستے کی دیوار بننا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا کہ وہ اسلام کے دروازے ہی سے واپس لوٹ جائے گا اور دوبارہ اپنے پرانے مذہب مسیحیت کی گود میں جا گرے گا کیونکہ مسیحیت نے کلیسا کے بدترین مظالم کی انسانیت سے معافی مانگ لی ہے اور اپنے آپ کو نہ صرف سائنس دوستی کے لیے پیش کر دیا ہے بلکہ سائنس کو قائدانہ کردار دینے پر بھی تیار ہے۔

انسانیت مذہب کے دروازے پر: جن مصنفین اور فلاسفہ کی کتابوں اور مقالہ جات و حوالہ جات سے زیر بحث فکر اپنی فکری بنیادیں تعمیر کرتی ہے اور سائنس کو اسلام کی بدترین مخالف اور اس کا اسلام سے ملاپ ناممکن قرار دیتی ہے، وہ وقت دور نہیں کہ مغرب کا علم و حقیقت کا متلاشی ذہن سائنسی تحقیق ہی کے نتیجے میں مغربی اغوا کاروں (سائنسی فلاسفہ) کی ان کتابوں اور افکار کو اٹھا کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دے گا اور اپنی روح کے مہیب اور بھیانک خلا اور پیاس کو بجھانے کے لیے مذہب کی طرف بے تابانہ لپکے گا۔ وہ وقت قریب ہے کہ خدا کا اقرار، خدا کی وحی اور رسالت و آخرت کی شدید احتیاج سائنسی انسان کو مذہب کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے گی۔ ایسے وقت میں جب کہ انسان اپنی سوچ و کاوش (سائنس) کی انتہا پسندیوں سے تنگ آ کر واپس اعتدال کی راہ ڈھونڈنا چاہے گا تو اسلام کی زیر بحث نمائندہ فکر اپنی سلبی سوچ اور غالی موقف کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے اپنا دروازہ بند کر لیتی ہے۔ اور انسانی سوچ و کاوش (سائنس) کو فطری راستہ دینے، اس کی رہنمائی کرنے اور اسے انسانی مسائل میں ایک بہترین خدمت گار کے طور پر قبول کرنے کے اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ نتیجتاً ایک ایسی ”رہبانیت“ پر مبنی اسلام کی مخرقانہ تعبیر کا علم بلند کرتی ہے جس کے اصولوں اور معیارات کو یہ خود بھی نہیں نباہ سکتی۔

زمین و آسمان نے اس سے زیادہ حسرتناک منظر شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ مغرب کے انسان کا اجتماعی ذہن جب مسیحیت کی مسخ شدہ اور غیر فطری تعلیمات کی خوفناک قید سے آزاد ہوا تو یہ بہترین وقت تھا کہ ان کے سامنے اسلام کا متوازن تعارف پیش کر کے انہیں اسلام سے ہم آغوش کر لیا جاتا لیکن اسلام کا درست تعارف نہ ہونے کی وجہ سے اور ابلیسی چالوں کے نتیجے میں پورا عالم مغرب لاندہیت اور

الحاد کی گود میں جا بیٹھا۔ اب صدیوں کے نامراد سفر کے بعد ایک بار پھر یہ اپنے فرسودہ مذہب (Scientism & Liberalism) سے نکلنا چاہتے ہیں اور مذہب کی آغوش میں واپس آنا چاہتے ہیں تو اسلام کے غلط تعارف کی وجہ سے اہلس کو اسلام کے بارے میں بدترین متعصبانہ پراپیگنڈہ کا موقع ہاتھ آجائے گا نتیجتاً ایک بار پھر صدیوں پر محیط ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد اسلام کا صحیح تعارف (فرسودہ مذہب یعنی سائنسزم کے پیروکار) سائنسی انسان تک نہ ہونے اور اسلام کے مخرفانہ اور مسخ شدہ تعارف سے وحشت زدہ ہو کر اور مغرب کا انسان لاندہ بیت سے تنگ اور بیزار ہو کر سچائی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو سچ کے نمائندے غائب ہیں، جب کہ میدان میں جو موجود ہیں وہ انسان کی زندگی کے ناگزیر معاون اور زاد راہ یعنی سائنس کو تسلیم کرنے ہی سے انکاری ہیں۔ نتیجتاً انسانیت ایک بار پھر الحاد سے نکل کر مسیحیت کی گود میں بیٹھنے کے لیے پرتول رہی ہے۔ دنیا مذہب کی کس حد تک پیاسی ہے، ہم ذیل میں ایک معروف امریکی جریدے ”بزنس ویک“ کی ۸ نومبر ۱۹۹۹ء کے شمارہ کے ایک مضمون "Religion in the Workplace" کے درج ذیل نکات سے اس کی وضاحت کرنا چاہیں گے:-

- ۱۔ امریکہ میں کام کی جگہوں پر 10,000 'بائبل اور دعائیہ' گروپ سرگرم ہیں۔
- ۲۔ امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیاں مثلاً Xerox، Taco Bell، Pizza Hut اور Wal-Mart Stores اپنے ملازمین کے روحانی ترفع کے لیے باقاعدگی سے سیشن منعقد کراتی ہیں۔
- ۳۔ امریکہ میں ۴۸٪ امریکی ہر روز کام کی جگہوں پر مذہب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔
- ۴۔ ۵۱ فیصد امریکی ہر روز ”دعا/عبادت“ کرنا چاہتے ہیں۔ (جاری ہے)

’جیو اور جینے دو‘

اہلس کا نعرہ ہے کہ میری اور میرے پیروکاروں کی خرمستیوں پر گرفت نہ کرو.....
قرآن تو مومن کو تاحیات اس منصب پر مامور کرتا ہے کہ ان کا تعاقب جاری رکھے اور ان کو بے لگام کبھی نہ ہونے دے۔ ’قاتلوہم حتی لا تکنون فتنہ‘
(ڈاکٹر انعام اللہ، انک)

مسلم معاشرے پر سیکولر ازم کے اثرات اور اہل علم و دانش کی ذمہ داری

فضل کریم بھٹی صاحب کا مضمون ہم دے تو رہے ہیں لیکن ہمیں ان کی بعض آراء خصوصاً ان کے اس رویے سے اتفاق نہیں ہے کہ وہ علماء پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ علماء خامیوں سے پاک ہیں یا مقدس گائے ہیں۔ یقیناً طبقہ علماء کو بھی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اصلاح محبت سے ہوتی ہے نہ کہ طنز و اتہام اور سخت لہجے و تند زبان میں۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ علماء جیسے بھی وہ ہیں، بہر حال ہمارے معاشرے میں دین کے نمائندے ہیں اور بقول ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم علماء کی ہوائیزی دین کی ہوائیزی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں علماء اور دینی مدارس کے بارے میں بات کرتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دینی مدارس کے حلقے سے اگر کوئی صاحب ان کا جواب دینا چاہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ مدیر

کچھ عرصہ ہوا اخبار میں ایک تصویر چھپی تھی جس میں لاکھوں افراد کا اجتماع دکھایا گیا تھا جو شریعت اسلامیہ کے خلاف مظاہرہ کر رہا تھا کہ ہمیں شریعت نہیں چاہیے۔ یہ تصویر ترکی کے ایک بڑے شہر استنبول کے ایک مظاہرے کی تھی۔ یاد رہے استنبول صدیوں تک خلافت اسلامیہ کا دار الخلافہ رہا ہے اور استنبول کا اصلی نام اسلامبول تھا جو بعد میں تبدیل کر دیا گیا۔ استنبول مسلم اکثریت کا شہر ہے اور اس مظاہرے میں اکثریت مسلمانوں کی ہی خیال کی جاتی ہے جو مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمیں شریعت اسلامیہ نہیں چاہیے۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مسلمان شریعت کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کریں، چنانچہ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یا تو ٹرک اتنے بگڑ چکے ہیں کہ مسلمان ہوتے ہوئے شریعت کے خلاف ہو گئے ہیں یا شریعت اتنی بگاڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی اور ناقابل عمل ہو گئی ہے حالانکہ اللہ کا دین تو قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کو دین مکمل ہو جانے کی نوید سنائی تھی اور اپنی نعمت تمام ہو جانے کا قرآن مجید میں اعلان کیا تھا اور اسلام کو بطور دین کے اپنی رضا مندی کی سند عطا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ترجمہ ”آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے

لیے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا۔“ (آیت ۳ سورۃ المائدہ، قرآن مجید ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی)۔ اس حالت میں جبکہ دین مادی اور روحانی زندگی کی بھرپور نعمتوں سے تمام تر مکمل ہے اور مکمل ضابطہ حیات ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیوں دوسرے طریقہ ہائے حیات کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں؟ کوئی مسلمان سیکولرزم کے پیچھے لگا ہوا ہے اور کوئی سوشلزم سے مشکل کشائی چاہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صحیح طور پر پیش نہیں کیا جا رہا۔

اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ ارب سے اوپر بتائی جاتی ہے جو مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا سے لے کر شمال مغربی افریقہ میں مراکو تک پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے ستاون (۵۷) آزاد ممالک ہیں۔ دنیا کے کثیر ذرائع مسلمانوں کے پاس ہیں۔ وہ خوراک کے وسیع ذرائع رکھتے ہیں، ایندھن کے ذرائع از قلم تیل اور گیس وافر مقدار میں رکھتے ہیں، روٹی، پٹ سن اور ربڑ موجود ہے۔ ان سب کے باوجود وہ خستہ حال اور مفلس ہیں۔ دنیا کی بیشتر اقوام کمپیوٹر دور سے نکل کر انفارمیشن ٹیکنالوجی میں داخل ہو گئی ہیں۔ مغربی اقوام تو ہم سے کافی ترقی یافتہ تھیں۔ جاپان بھی کچھلی صدی کے شروع میں ہی ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ اب چین ہمارے سامنے تیس چالیس سال میں سپر پاور بن گیا ہے۔ انڈیا جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے وہ جلد ہی ایک بڑی طاقت بن جائے گا۔

مسلمانوں کی موجودہ افسوس ناک حالت

مسلمان جس جگہ بھی ہیں انتشار اور خلفشار کا شکار ہیں۔ مسلمانوں کے ۵۷ آزاد ممالک ہیں لیکن کسی ملک میں بھی صحیح اسلامی قانون کی حکومت نہیں ہے۔ مسلمانوں میں ہر جگہ انتہا پسندی اور شدت پسندی ہے قرآن و سنت کی کہیں عمل داری نہیں۔ ایران کہنے کو تو اسلامی جمہوریہ ہے لیکن وہاں انتہا پسند اثنا عشری شیعہ فرقہ کے مٹا حکمران ہیں۔ وہاں سنیوں کی آبادی ۳۰ سے ۴۰ فی صد بتائی جاتی ہے لیکن سنی اپنی مسجدیں نہیں بنا سکتے۔ وہاں غیر مسلموں کو سنیوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں جو وہاں اپنی عبادت گاہیں، چرچ اور مندر بنا سکتے ہیں۔ افغانستان میں طالبان اپنی تعبیر کا اسلام لائے تھے انہوں نے ملک کو طاقت اور بندوق سے فتح کیا۔ وہاں مسلم عوام الناس کو رائے دہی کا حق نہیں تھا لیکن انہوں نے ملک میں عدل و انصاف جلد اور سستا فراہم کیا، امن و امان کی حالت بہت اچھی کر دی اور منشیات کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم اپنے چار پانچ سالہ دور اقتدار میں کوئی ترقیاتی کام نہ کر سکے اور جدید دور کے مطابق تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہ کر سکے۔ وہ افغانستان کو قرون وسطیٰ سے جدید دور میں داخل نہ کر سکے۔ پاکستان بھی آزادی

کے ۶۵ سال بعد بھی اپنا قانون نہیں بنا سکا اور ہم ابھی تک انگریز کے قانون پر چل رہے ہیں۔ ملک میں ۹۵ فی صد مسلمان ہیں لیکن اُن کو توفیق نہیں ہوتی کہ موجودہ دور اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانون بنائیں۔ قائد اعظم اور مسلم لیگ کا وعدہ تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنائیں گے لیکن ہم اس طرف کوئی پیش رفت نہیں کر سکے۔ ہر فرقہ اسلام کی اپنی تعبیر رکھتا ہے اس لیے ہم اسلامی قانون نہیں بنا سکے۔ پاکستان کے مسلمانوں میں فرقہ بندی کی وجہ سے ہم شریعت کا قانون نہیں لاسکے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے نظام تعلیم کی خرابی ہے۔

اس وقت ہمارا نظام تعلیم دینی مدارس اور جدید درس گاہوں پر مشتمل ہے۔ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔ ہر مسلمان جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات یا قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے وہ زراعت، صنعت و حرفت، سروسز یا کسی بھی حلال پیشے سے روزی کما رہا ہے وہ دین کے مطابق ہی ہے۔ اسی طرح ہمارا نظام تعلیم ماضی میں ایک ہی تھا اور صدیوں تک ایک ہی رہا لیکن جب انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو مغلیہ عہد کا نظام تعلیم ختم کر دیا اور اپنا نظام تعلیم قائم کر دیا۔ یہ سیکولر بنیادوں پر استوار تھا اور مسلمانوں کے مذہب، تہذیب و تمدن اور کلچر کے خلاف تھا اس لیے علماء نے اس کی مخالفت کی اور اس کا بائیکاٹ اور مقاطعہ کیا۔ انہوں نے منطقی اور دینی لحاظ سے یہ بالکل ٹھیک کیا لیکن وہ اس سیکولر اور لادین نظام تعلیم کے خلاف مسلمانوں کو جدید حالات اور عصر حاضر کے مطابق ایسا نظام تعلیم اور نصاب اسلامی تیار کر کے نہ دے سکے جو اُن کی وقت کے مطابق ضرورت پوری کر سکے۔ مسلمانوں کے اہل علم و دانش آغاز اسلام سے علمائے اسلام یا علمائے دین ہی تھے جب قرون وسطیٰ میں بنوعباس کے دور میں یونانی، ہندوستانی اور ایرانی علوم و فنون کے تراجم ہوئے اور اُن کی وجہ سے منطق اور فلسفہ کی راہ سے گمراہیاں پھیلنے لگیں تو علمائے اسلام نے جن میں امام غزالی، امام ابن تیمیہ، امام فخر الدین رازی اور بعض دیگر علماء شامل تھے بڑی محنت سے اُن گمراہیوں کا مقابلہ منطق، فلسفہ اور دوسرے فنون سیکھ کر کیا اور اُمت اسلامیہ کو سیدھے راستے پر رکھا جس سے نئے نئے فنون پیدا ہوئے جن میں ایک علم الکلام بھی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے دور کے علماء ایسا نہیں کر سکے۔ ہمارے دور کے علماء نے جب دیکھا کہ مغربی اقوام نے ہمیں غلام بنا لیا ہے اور اُن کے علوم و فنون بطور ایک حکمران قوم کے مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں تو انہوں نے اس میں عافیت جانی کہ اُن کی تعلیم کا بائیکاٹ کیا جائے اور مغربی علمی یلغار کا مقابلہ اس طرح کیا جائے کہ اپنے علیحدہ جزیرے بنا لیے جائیں جن کو بعض حضرات اسلام کے جزیرے اور بعض حضرات اسلام کی قلعہ بندیاں کہتے ہیں۔ یہ وہ سوچ تھی جس کو منفی سوچ کہا جاسکتا ہے۔ اسی سوچ کا نتیجہ

درس نظامی کے نصاب کو جاری رکھنا ہے۔ یہ نصاب ملاً نظام الدین متوفی ۱۷۶۷ء نے تیار کیا تھا جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق بالکل ٹھیک تھا لیکن اب تک ہمارے دینی مدرسوں میں رائج ہے۔ یہ نصاب ۱۸۳۲ء میں ازکار رفتہ اور فرسودہ ہو گیا جب لارڈ میکالے انگریزی نظام تعلیم لایا۔ اس میں جتنی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ صدیوں پرانی ہیں۔ یہ نصاب مساجد کے پرانے ٹائپ کے آئینہ اور خطیب اور قدیم طرز کے مدرس اور مفتی تیار کرتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انہی مدرسوں کی وجہ سے مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور اسی سے اسلام زندہ ہے۔ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ مسلم معاشرے کی زبوں حالی کو دیکھ کر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا!

مولانا مودودی، ہمارے دور کے عظیم اسلامی مفکر تھے۔ انہوں نے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے اپنی زندگی میں کئی مضمون لکھے۔ وہ قدیم نظام کے بھی سخت مخالف تھے اور جدید نظام تعلیم کو بھی زہر سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں نظام تعلیم کی دوئی اور شوبہ کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قدیم نظام تعلیم کے متعلق وہ لکھتے ہیں ”اب جو لوگ اس نظام تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اس طرح ان کی ذات سے کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچتا ہے یعنی ان کی بدولت ہمارے اندر قرآن و دین کا کچھ نہ کچھ علم پھیلتا ہے، دین کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اور ہماری مذہبی زندگی میں کچھ نہ کچھ حرارت باقی رہ جاتی ہے لیکن اس کے فائدے کے مقابلے میں جو نقصان ہم کو پہنچ رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں، نہ ان کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کی بجائے الٹی اس میں کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعے سے ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آرہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا کیونکہ ان کی ضروریات زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔“

(تعلیمات، صفحہ ۱۲، ۱۳)

ملت اسلامیہ کی تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ علمائے حق نے دین کی سر بلندی کے لیے بڑی بے جگری سے قربانیاں دی ہیں اور جب اُن میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو صوفیائے عظام نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی صحیح رہنمائی کی لیکن مرور زمانہ سے ان دونوں میں زوال اور انحطاط آگیا اور تقلیدی جمود طاری ہو گیا جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنے عذاب کا کوڑا برسایا جس سے منگول، تاتاری اور صلیبیوں نے انہیں پامال کیا اور اُن کے کئی ممالک برباد کر دیے اور بڑے بڑے شہر ویران کر دیے۔ مسلمان کچھ عرصے کے لیے سنبھلے لیکن پھر زوال کا شکار ہو گئے اور آخر مغربی اقوام نے اُن کو غلام بنالیا۔ غلامی کے بعد علماء کی سوچ منفی ہو گئی اور وہ ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی نہ کر سکے۔ ملت اسلامیہ کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ پاکستان اور ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں مثبت اور تخلیقی سوچ نہ اپنا سکے۔ اُن کے سامنے مغرب کی اقوام ترقی کر رہی تھیں لیکن مسلمان علماء نے اُن سے کچھ نہ سیکھا بلکہ عصر حاضر سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر انہوں نے اپنے گرد تقدس اور بزرگی کا ایسا ہالہ بنالیا کہ ہم قرآن اور حدیث پڑھتے پڑھاتے ہیں اس لیے ہمیں کسی سے کوئی چیز سیکھنے کی ضرورت نہیں اور وہ قرون وسطیٰ کی تفسیریں، اُن کے حاشیے اور شرحیں پڑھتے پڑھاتے رہے۔ اُن کے نزدیک دنیا کی گردش اٹھارویں صدی میں آکر رک گئی تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ کا دین تو قیامت تک ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ زمانے کی گردش کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جس کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں حل مل سکتا ہے لیکن جن کے لیے ابھی تک دنیا کائنات کا محور ہے وہ زمانے کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ آخر جب علماء مسلم عوام کے مسائل حل نہ کر سکے تو پھر عوام نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور وہاں سے سرسید احمد خان جیسے لوگ سامنے آئے اور ہم میں دین و دنیا کی تفریق پیدا ہو گئی اور مسلم معاشرہ تقسیم کا شکار ہو گیا۔

ہمارے دور میں مسلم معاشرہ عجیب انتشار کا شکار ہے۔ ہم میں ایسے علماء تقریباً ناپید ہیں جو دین و دنیا کے جامع ہوں۔ قدیم مدرسے قدیم علماء تیار کرتے ہیں لیکن وہ جدید علوم و فنون سے نابلد ہیں۔ کسی زمانے میں مسلم عوام، علمائے اسلام اور اولیاء عظام کے گرویدہ تھے۔ جہاں کہیں ایسے بزرگ وعظ و نصیحت کے لیے آتے تھے ہزاروں مسلمان اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اب علماء اور مسلم عوام میں اتنا بُعد پیدا ہو گیا ہے کہ مسلم عوام علماء کو اپنا رہنما اور ہادی نہیں سمجھتے بلکہ اُن کو علماء ہی نہیں سمجھتے۔ اسی طرح علماء نے بھی اپنا کبھی

احتساب نہیں کیا۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ہم قرآن وحدیث کے عالم فاضل ہیں اس لیے ہم غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ اس طرح جو تقدس مآب بن جائے وہ کب کسی کی سنتا ہے؟ حضرت عیسیٰ کے نام لیوا پادریوں نے بھی عیسائیت کو اپنی مرضی کا مذہب بنالیا اور یہی المیہ ملت اسلامیہ کو پیش آیا۔ جس کو ہم اسلامی قانون، شریعت اسلامیہ یا شریعت کہتے ہیں اُس کا حشر کچھ ایسا ہی ہوا۔ تُرکی میں جب خلافت اسلامیہ کی اصلاح کی کوشش کی گئی تو تنگ نظر علماء اور جاہل صوفیوں نے اُس کی سخت مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تفسیر بالصاری قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ کا استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ یہ وہ اسلام تھا جو اُس وقت کے علماء اور صوفیا پیش کر رہے تھے جس کا نتیجہ سیکولرزم کی شکل میں سامنے آیا۔ اس طرح تُرک مسلمان ایسی شریعت سے جو تنگ نظر علماء اور جاہل صوفیا کی ایجاد تھی، اتنا تنگ پڑے کہ وہ اسلام کو ہی چھوڑ بیٹھے۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال کی ڈکٹیٹر شپ نے ہزاروں ایسے علماء اور صوفیا کو تہ تیغ کر دیا اور ہزاروں قید کر لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے جب ایسی جاہل اور نافرمان نسلیں ختم ہو گئیں تو اب تُرکی میں انقلاب آ رہا ہے اور نئے دین دار لوگ تُرکی کو دین کی طرف پلٹا کر لے جا رہے ہیں۔

پچھلے سال عرب ملکوں میں جو آزادی کی لہر چلی ہے وہ عرب سپرنگ مشہور ہوئی۔ اس میں مصر، لیبیا اور تیونس میں تو جمہوری حکومتیں آ گئی ہیں لیکن شام میں نصیری شیعہ فرقہ شام کی اکثریت سنی آبادی کا قتل عام کر رہا ہے۔ ایران اور لبنان کے شیعہ بشار الاسد کی پشت پر کھڑے ہیں اور اُس کی مدد کی جا رہی ہے۔ ایران اکاون (۵۱) فی صد بحرینی شیعوں کی مدد جمہوریت کے نام پر کر رہا ہے لیکن اسی فیصد شامی سنیوں کے خلاف نصیری فرقے کی مدد کرتے ہوئے جمہوری اصولوں کو بھول جاتا ہے۔ مسلمانوں کی بربادی کے دو عناصر مذہ دار ہیں ایک قومیت اور وطنیت اور دوسرے مذہبی تفرقہ بازی۔ جب تک ہم ان دو خطرناک بیماریوں سے نجات نہیں حاصل کریں گے ہم دوسری قوموں کے دستِ نگر اور پسماندہ ہی رہیں گے۔ (جاری)

مغرب کی ذہنی غلامی اور اقبالؒ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آزاد ملک حاصل کرنے کے ۶۵ سال بعد بھی ابھی تک ذہنی اور فکری طور پر گوری چڑی والوں سے آزادی حاصل نہیں کر سکے۔ آج بھی انگریز کی زبان اور اس کا لباس ہمارے لیے زیادہ قابل عزت ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی تہذیب ہماری تہذیب سے بہتر ہے اور اس کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ ہم سے اعلیٰ ہے یہ ذہنی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا۔

بند بر پائست بر جان و دل است
مشکل اندر مشکل اندر مشکل است

غلامی کی بیڑیاں ہمارے پاؤں میں نہیں بلکہ دل و دماغ پر پڑی ہیں اور تمام مشکلوں کی اصل مشکل یہی ہے۔ غلامانہ سوچ اور غلامی پر آمادگی سے اقبال کو اس قدر نفرت تھی کہ وہ غلامی کی زندگی گزارنے اور غلامی کی خورکھنے والے کو کتے سے بھی بدتر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۔

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگ پیش سگ سرخم کرد

یہ غلامی کی خو تو کتے سے بھی بدتر ہونے کی علامت ہے اس لیے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کتے نے کسی دوسرے کتے کے آگے سر جھکایا ہو۔ پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ۔

بگوشم آمد از خاک مزارے
کہ در زیرِ زمیں ہم می توان زیست
نفس دارد و لیکن جاں ندارد
کسے کو بر مرادِ دیگران زیست

میں ایک قبر کے قریب سے گزرا تو مُردے کی آواز آئی کہ قبر کے اندر بھی زندہ رہا جاسکتا ہے لیکن اس شخص کی جو غلامی کی زندگی جی رہا ہے سانس تو چل رہی ہے لیکن درحقیقت اسے 'زندہ' کہلانے کا حق حاصل نہیں۔ اقبال کی غلامی سے اسی نفرت اور اپنی قوم کی غلامی پر رضامندی ہی نے ان کو خدا سے اس شکوے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

بین المسالک تکفیر غلط ہے

پاکستان کے سارے مکاتب فکر کے ثقہ اور معتدل مزاج علماء کرام باہمی تکفیر کو غلط قرار دیتے ہیں۔ یہاں ہم مختلف مکاتب فکر کے علماء کی آراء درج کر رہے ہیں۔

حنفی بریلوی مکتب فکر

مولانا صدیق ہزاروی ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جو کسی کلمہ گو کو مشرک یا بدعتی قرار دینے ہیں۔ انہوں نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں لکھا:

”اہل سنت (بریلوی) کسی کلمہ گو کو مشرک اور بدعتی قرار نہیں دیتے اور کسی نئے اچھے کام کو بدعت حسنہ سمجھتے ہیں جبکہ قرآن و سنت سے متصادم نئے کام کو بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں، اس کی مذمت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی بدعت سیئہ ہے۔“

حنفی دیوبندی مکتب فکر

اس سلسلے میں مولانا اللہ یار خاں اپنا نقطہ نظر اختصار کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

”ہم کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔ جب تک وہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا منکر نہ ہو“۔ (۱)

اس ضمن میں یہ سوال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ کیا کوئی مسلمان ارتکاب گناہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے یا نہیں، اس سوال کا جواب مولانا اللہ یار خاں کی اس عبارت میں موجود ہے:

”ارتکاب گناہ کی وجہ سے ہم کسی مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔ البتہ گناہ گار بغیر توبہ کے مرگیا تو پھر بھی سزا بھگت کر جنت میں جائے گا“۔ (۲)

۱- اللہ یار خاں، عقائد و کمالات علمائے دیوبند، ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، دارالعرفان، منارہ ۱۹۹۹ء، ص ۲۶

۲- ایضاً ص ۱۳، ۱۴

مولانا محمد خان شیرانی نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایمانیات مجمل ہیں مثلاً شرک قبیح ہے یا بدعت قبیح ہے۔ قرآن و سنت سے یقینی طور پر یہ اجمال ثابت ہے۔ ان کی تفصیلات اجتہادی اور فنی ہیں، ایمانیات میں شمار نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی مسلمان کسی عمل کو شرک یا بدعت سمجھے تو نہیں کرے گا اور نہ ہی کرنا چاہیے لیکن اگر وہ اپنے اجتہاد یا معلومات کے مطابق کسی عمل کو شرک یا بدعت نہ سمجھے تو پھر اس کی اپنی مرضی ہے۔ نیز ہر اجتہاد کی پابندی خود مجتہد پر تو واجب ہے لیکن اس کے اجتہاد کو دوسروں پر تکمیل کرنا اس کا حق نہیں۔ فتوے ہمیشہ تکمیل کے میدان میں لگتے ہیں، عمل کے میدان میں نہیں لگتے۔ اگر کوئی مجتہد خود اپنے اجتہاد پر عمل کرے اور دوسروں پر تکمیل نہ کرتے تو فتوے کی نوبت نہیں آئے گی۔ فتوے کی نوبت تب آئے گی جب کوئی مجتہد یا عالم یہ کہے کہ میرے اجتہاد یا علم کو ضرور مان لو۔ تقلیدی ایمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شک ڈالوانے والا نکرا جائے تو اس کے ایمان میں تزلزل آئے گا۔ یہ ایمان بہ اتفاق علماء قابل قبول نہیں لیکن اگر ایک شخص اس تقلیدی ایمان میں اتنا مضبوط و مستحکم ہو کہ کسی بھی صورت اس میں تزلزل واقع نہ ہو تو اس کو بھی امام ابوحنیفہؒ کے سوا دوسرے آئمہ کرام ایمان تسلیم نہیں کرتے۔ خود امام ابوحنیفہؒ بھی مقلد کے ساتھ اپنے ایمان کی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اسے گناہ گار سمجھتے ہیں۔ نیز علم کلام کے جتنے اختلافات ہیں وہ ذات باری اور صفات باری کے بارے میں ہیں جبکہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کی مصنوعات میں غور کرو،

ذات میں نہیں۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ. (الشوریٰ ۴۲: ۱۱)

انسان کی مصنوعات کسی اور سیارے کی مخلوق کے پاس پہنچ جائیں جبکہ وہ خود انسان کی ذات اور صفات سے واقف نہ ہو، اور اس کی ذات اور صفات کا اندازہ اس کی مصنوعات سے لگائے تو ہر اندازہ غلط ہوگا۔ اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ یہ سب انسان کی بنائی ہوئی مصنوعات ہیں خود انسان ان جیسا نہیں، یہی جامع جواب ہوگا۔ تفصیلات میں جس قدر جائیں گے غلط ہوگا۔

نیز یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مطابق ایمان بسیط ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس جو دو چیزوں کا تقدس مایہ ہے، وہ ہے جان اور مال اور وہ ان دونوں میں منافع کی غرض سے تصرف کرتا

ہے تو یہ ہے ”تجارت“ جبکہ ایمان ”عقد بیعہ“ ہے انسان کی جانب سے جان اور مال کا، اللہ کے ساتھ اور اعمال ”تسلیم مبیعہ“ ہے لہذا ایمان ”عقد بیعہ“ بسیط ہے، اعمال اس کا جز نہیں ہیں۔ البتہ ایمان ”تسلیم مبیعہ“ ہے جو قیمت کے لیے شرط ہے۔

توحید اور شرک اصولی باتیں ہیں، مثلاً قرآن حکیم میں ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اغْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ (البقرہ ۲: ۲۱)

یعنی تمام انسانیت کا دو باتوں پر اتفاق ہے ایک خلق یعنی نیست سے ہست کرنا اور دوسرا رزق یعنی زندگی کے وسائل کی فراہمی، یہ دونوں اللہ سے مختص ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ دو مزید باتیں مانتی پڑیں گی: ایک ہدف اور دوسرے استعمال۔ یہ ہدایات کے اس مجموعے میں اللہ نے بتائے ہیں جس کا نام قرآن ہے۔ اگر اشتباہ ہے تو قرآن کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ یہ خالق کی جانب سے ہے یا بندے نے خود بنایا ہے۔ اس کی آزمائش کا راستہ یہی ہے کہ کوئی سورت اس جیسی بنالاء۔ جب ثالث کی نوبت آئے گی کہ تمہاری بنائی ہوئی سورت اس کی ہم پلہ ہے یا نہیں تو وہ مجھ پر نہ چھوڑیں چونکہ میں فیصلہ کروں گا تو فیصلہ پھر اسی راستے سے بھیجوں گا تو پھر اسی مشکل میں رہو گے، جس میں اس وقت ہو لہذا اپنی معاونت اور ثالثی کے لیے بھی ”وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ“ (البقرہ ۲: ۲۳) جو تمہارے خطبوں اور قصیدوں کے نمبر لگاتے ہیں، ان سے فیصلہ لو اگر وہ آپ سے کہیں کہ تمہارا بنایا ہوا سورہ اس سورہ کے ہم پلہ ہے تو تب بھی نہ مانو لیکن نہ کر سکو اور رہتی دنیا تک نہ کر سکو گے پھر تو مان لو کہ جو میں خالق و رازق ہوں اپنے خلق و رزق کے ہدف اور استعمال کا مجموعہ میں نے بھیجا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ یقین رکھے اور اقرار کرے کہ خلق اور رزق دونوں اللہ کے ہیں، ہدف اور استعمال وہی خالق و رازق مجھے بتائے گا اور اس نے بتایا ہے۔ ہدایات کا مجموعہ یہ کتاب ہے جو قرآن ہے اور اس کا عملی نمونہ نبی ﷺ کی سیرت اور سنت ہے۔ اب اس کے بعد کیا اسے ہم موحد کہیں گے یا اس سے انتظار کروائیں گے کہ فلاں مجتہد یا عالم نے ہدایت کے اس مجموعے سے اور نبی ﷺ کی سیرت و سنت سے جس قسم کا ذہن زندگی کی روش کے لیے بنایا ہے اگر من و عن اسے تسلیم کرو گے تو موحد رہو گے ورنہ مشرک بن جاؤ گے؟ تو یہ توحید و شرک اللہ کی الوہیت میں ہوگا یا عالم کے علم میں ہوگا؟

اہل حدیث مکتب فکر

شیخ عبداللہ بن عبدالحمید اثری نے اپنی کتاب ”الوجیز فی عقیدۃ السلف الصالح اہل السنۃ والجماعۃ“

میں مسئلہ تکفیر کے بارے میں اپنا نظریہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”عقیدہ سلف صالحین اہل السنۃ والجماعۃ اہل الحدیث کے اصول میں سے ایک اصل ثالث یہ بھی ہے کہ: ”وہ اہل اسلام میں سے کسی بھی خاص شخص کو کافر قرار نہیں دیتے کہ جو ایسے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے جس سے کفارہ لازم آتا ہو، الا یہ کہ: اُس حجت و دلیل کے قائم ہو جانے کے بعد کہ جس دلیل و حجت کا تارک (صراحتاً) کفر کر رہا ہو چنانچہ (۱) اس ضمن میں شروط بھی وافر پائی جائیں (۲) اس کے کفر میں داخل ہونے کی تمام رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں (۳) اپنے کسی فہم کا مطلب بیان کرنے والے اور جاہل آدمی سے شک و شبہ بھی زائل ہو جائے۔“

اور یہ بات معلوم ہے کہ ایسا پوشیدہ امور میں ہوگا کہ جو کشف و بیان کے محتاج ہوں، بخلاف ظاہری امور کے، جیسے کہ: اللہ عزوجل کی ذات اقدس کے وجود کے متعلق دانستہ طور پر انکار کرنا اور نبی مکرم ﷺ کی تکذیب کرنا اور آپ ﷺ کی ختم نبوت اور تاقیامت صرف آپ کی ہی رسالت کا جان بوجھ کر انکار کرنا۔

اور یہ کہ اہل السنۃ والجماعۃ سلفی جماعت حقہ کے لوگ ایسے آدمی کو کافر قرار نہیں دیتے جو کفریہ الفاظ و افعال ادا کرنے پر مجبور ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مکمل طور پر مطمئن ہو اور نہ ہی وہ مسلمانوں میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں اگرچہ اس گناہ کا تعلق کبار سے ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ ہے کہ یہ گناہ شرک ہو۔ پس ایسی حالت میں وہ ایسے کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے پر کفر کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ بلا شک و شبہ وہ اس پر فسق اور ایمان کے ناقص ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں الا یہ کہ جب تک اس کا گناہ اس پر کفر کے فتویٰ کو جائز نہ کر دے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا. (النساء: ۴: ۴۸)

”بے شک اللہ شرک کو تو بخشنے والا نہیں اور شرک کے سوا (جو گناہ ہیں) جس کو چاہے بخش دے (اور جس کو چاہے نہ بخشنے، عذاب کرے) اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بڑا گناہ باندھا۔“

اور دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی قدر ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الزمر: ۵۳)

”اے پیغمبر ﷺ) کہہ دے (اللہ عزوجل فرماتے ہیں: میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی مہربانی سے ناامید نہ ہو، کیونکہ اللہ سب گناہوں کو (شرک کے سوا) بخش دیتا ہے، بے شک وہی (بڑا) بخشنے والا مہربان ہے۔“

اور اہل السنۃ والجماعۃ، سلفی جماعت حقہ کے لوگ کسی بھی آدمی پر کسی بھی گناہ کی وجہ سے کفر کا حکم صادر نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت سے اس بات پر دلیل نہیں لے لیتے کہ یہ فعل واقعاً کفر کا فعل و قول ہے اور جب بندے کی موت اسی حالت میں واقع ہو جائے یعنی کسی بھی عالم کو ایسی کوئی بھی دلیل نہ مل سکے کہ جس فعل و قول کا اُس نے ارتکاب کیا تھا وہ صراحۃً کفر تھا تو اس کا معاملہ اللہ رب العالمین کے سپرد ہوگا۔ اگر وہ چاہے تو اس کو عذاب دے اور اگر چاہے تو وہ اس کو معاف کر دے۔ اہل السنۃ والجماعۃ سلفی جماعت حقہ کا یہ موقف و منہج ان گمراہ فرقوں کے بالکل خلاف و برعکس ہے جو کبیرہ گناہ کے مرتکب پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ایما امری قال لایحیہ: یا کافر، فقد باء بها احدهما ان کان کما قال: والا رجعت علیہ۔“

وقال: ”من دعا رجلا بالكفر، او قال: عدوا للہ! ولیس کذلک الا حار علیہ“ (۱)

جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کو، اے کافر! کہہ کر پکارا تو دونوں میں سے ایک پر کفر آجائے گا۔ اگر وہ شخص کہ جسے اُس نے کافر کہہ کر پکارا ہے وہ واقعاً کافر ہے، تو پھر ویسا ہی ہے جیسا اُس نے کہا۔ بصورت دیگر یہ کفر پکارنے والے پر لوٹ آئے گا اور پھر فرمایا کہ: جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا کہے: او اللہ کے دشمن! حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے تو کفر اس پکارنے والے پر پلٹ آئے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے خود سماعت کی: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

”لا یرمی رجل رجلا بالفسوق، ولا یرمیہ بالكفر، الا ارتدت علیہ، ان لم یکن صاحبہ کذلک۔“

وقال: ومن قذف مومنا بکفر: فہو کقتلہ۔

وقال: اذا قال الرجل لاخيه: يا كافر فقد باء به احدهما^(۱).
 ”کوئی بھی (مسلمان) آدمی کسی دوسرے (مسلمان) آدمی پر راہ حق سے انحراف کی
 تہمت نہ دھرے اور نہ ہی اُس پر کفر کی تہمت دھرے۔ اگر وہ حقیقت میں کافر و فاسق
 نہ ہوا تو خود کہنے والا فاسق اور کافر ہو جائے گا۔“

اور پھر فرمایا کہ: اور جو کسی مسلمان آدمی پر کفر کی تہمت لگائے گا (اور وہ کافر نہ ہو) تو
 ایسا ہے جیسے اس کا خون کیا۔“ اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ”جب کسی آدمی نے
 اپنے (مسلمان) بھائی کو ”اے کافر! کہا تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہوگا۔“
 اور اہل السنۃ والجماعۃ سلفی جماعت حق، اہل بدعت پر معصیت یا کفر کا مطلق طور پر حکم لگانے اور
 کسی معین شخص پر کہ جس کا اسلام بالیقین ثابت ہو..... اور اس سے کسی بدعت کا ارتکاب ہو جائے.....
 اس طرح کا کوئی حکم لگانے کے درمیان ہمیشہ فرق کیا کرتے ہیں، کہ ایسا شخص تو بلا شک و شبہ گناہ گار ہو
 گا یا پھر راہ حق سے انحراف کرنے والا (فاسق) یا پھر کافر۔ چنانچہ..... اس آدمی پر وہ ان تینوں میں
 سے کوئی بھی حکم تب تک نہیں لگاتے حتیٰ کہ اس پر حق واضح ہو جائے اور وہ بھی دلیل و حجت قائم کر کے
 اور شک و شبہ کا ازالہ کر کے اور اس معاملہ کا تعلق خفیہ امور سے ہے نہ کہ ظاہری امور سے۔ پھر وہ کسی
 معین آدمی کی تکفیر نہیں کرتے مگر یہ کہ جب اُس میں کفر والی تمام شروط متحقق ہو جائیں اور اس ضمن میں
 تمام موانع دور ہو جائیں۔

سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ: میں نے خود سماعت کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کان رجلان فی بنی اسرائیل متواخیین، فکان احدهما یذنب،
 والاخر مجتہد فی العبادۃ، فکان لا یزال المجتہد یری الاخری علی
 الذنب، فیقول: اقصر، فوجده یوما علی ذنب: فقال له: اقصر، فقال:
 خلنی وربی ابعث علی رقیبا؟ فقال: واللہ لا یغفر اللہ لک. او لا
 یدخلک اللہ الجنة! فقبض ارواحہما، فاجتمعا عند رب العالمین،
 فقال لہذا المجتہد: اکتب بی عالما، او کنت علی مافی یدی قادر؟
 وقال للمذنب: اذهب فادخل الجنة برحمتی، وقال للآخر: اذهبو بہ

۱- رواہ البخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر ۶۰۴۵، ۶۰۴۷، ۶۱۰۳

الى النار. قال ابو هريرة: والذى نفسى بيده! لتكلم بكلمة او بقت
دنياه واخرته^(۱).

”بنو اسرائیل میں دو آدمی باہم بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا جب کہ دوسرا آدمی عبادت میں بہت محنت کرنے والا تھا۔ چنانچہ عبادت میں محنت کرنے والا اپنے دوسرے ساتھی کو ہمیشہ گناہ کرتے ہوئے دیکھتا تو اُس سے کہتا: باز آ جاؤ۔ ایک دن اس نے اسے ایک گناہ کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس سے وہ کہنے لگا: باز آ جاؤ۔ وہ شخص اُس عبادت گزار سے کہنے لگا: آپ میرے اور میرے رب کے درمیان مداخلت نہ کریں۔ کیا آپ میرے اوپر نگران بنا کر بھیجے گئے ہیں؟ وہ عبادت گزار کہنے لگا: اللہ کی قسم! اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یا اس نے یوں کہا کہ: اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا اور پھر جب دونوں فوت ہو گئے تو وہ دونوں اللہ رب العالمین کے ہاں اکٹھے ہوئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مختی عبادت گزار سے کہا: کیا تجھے میرے متعلق علم تھا؟ یا تُو اس پر جو میرے ہاتھ میں اختیار ہے اُس پر قدرت رکھتا ہے؟ اور پھر گنہگار سے فرمایا: جاؤ تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ اور دوسرے کے میں بارے میں فرمایا: اسے جہنم میں لے جاؤ۔ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے تھے: اُس ذات اقدس کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اُس شخص نے ایک ایسی بات کی جس نے اُس کی دنیا بھی تباہ کر دی اور اُس کی آخرت بھی۔“

اہل تشیع کی رائے

اس حوالے سے مولانا سید افتخار حسین نقوی نے کہا:

مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تکفیر سے اجتناب کرنا چاہیے، یہ بہت خطرناک عمل ہے۔ ماضی میں خوارج کی یہی روش رہی ہے۔ اگر ہر مسلک ایک دوسرے کو کافر قرار دینے لگے تو کوئی مسلمان نہیں بچے گا۔ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے یہ دعوت دی:

”قولوا لا اله الا الله تفلحوا“.

یعنی لا اله الا الله کہو اور فلاح پا جاؤ۔

۱- صحیح سنن ابی داؤد، للعلامی، کتاب الادب، باب النہی عن الغی، حدیث ۴۹۰۱

توہین رسالت کا مسئلہ

اور عمار خان ناصر

از مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد

یہ ۶۱ صفحے کا ایک کتابچہ ہے جو مفتی صاحب نے عمار خان ناصر (مدیر ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ) کی کتاب ’توہین رسالت کا مسئلہ‘ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے کتابچے کے تعارف میں لکھا ہے کہ ”عمار ناصر صاحب کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ذمی یعنی مسلمان ملک کا فرشتہ اگر توہین رسالت کا ارتکاب کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟“ انہوں نے بھی وضاحت کی ہے کہ ’اس تنقیدی جائزے سے غرض کسی خاص واقعہ یا مقدمہ سے متعلق کچھ لکھنا نہیں ہے بلکہ غرض صرف اتنی ہے کہ عمار خان صاحب نے اپنی کتاب کے ذریعے سے جو مغالطے دینے کی اور امت میں انتشار پھیلانے کی جو کوشش کی ہے، اس کا توڑ ہو سکے اور لوگ ان کے مغالطوں کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔“

اس مسئلے میں علمی اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ علماء امت اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی نبی کریم ﷺ کی توہین کرے (اختلاف نہیں توہین، اختلاف اور چیز ہے جس کی گنجائش نکلتی ہے) تو یہ ایک جرم ہے (کیونکہ اس سے مسلمانوں کے بنیادی عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہے اور چونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کرتے ہیں لہذا انہیں اذیت پہنچتی ہے، ان میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ قتل و غارت اور فساد ہوتا ہے) اس لیے یہ جرم کرنے والا بڑی سے بڑی سزا (یعنی سزائے موت) کا مستحق ہے جیسا کہ خود آنجناب ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے۔ تاہم احناف میں سے بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ہو اور دوران اختلاف و مناقشہ اگر اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو آنحضرت ﷺ کی تکریم کے خلاف ہو اور یہ آدمی اس پر معذرت کرے، آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرے اور وہ اس کا عادی نہ ہو اور نہ یہ اس کی پلاننگ ہو تو ایسے آدمی کی معافی قبول کی جاسکتی ہے یا اسے کوئی ہلکی سزا دی جاسکتی ہے۔ یہ رائے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بعض علماء احناف کی ہے جب کہ علمائے امت کی بہت بڑی اکثریت (یعنی ائمہ ثلاثہ، اہل حدیث، اہل تشیع اور اکثر احناف) کی رائے یہ ہے کہ توہین رسالت کا مرتکب مستحق سزائے موت ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی۔ اور یہ بات پہلی ملتوں میں بھی تھی اور

اسلام میں بھی ہے کہ جو بڑے اور قبیح جرائم ہیں ان کے مرتکب کو سخت سزا دی جائے تاکہ ایسی خصلت رکھنے والے لوگ اس سزا سے ڈریں، عبرت پکڑیں اور اس جرم سے باز رہیں۔

مذکورہ رائے پہلے بھی معمولی اقلیت کی رائے تھی اور اب جب کہ پاکستانی عوام اور علماء کی رائے و خواہش کے مطابق پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں اور پارلیمنٹ نے جمہور امت اور جمہور علماء کی رائے کے مطابق پاکستان میں توہین رسالت کی سزائے موت ہونے کا قانون پاس کر دیا ہے تو بات ختم ہوگئی اور اس اختلاف رائے کی اہمیت محض ایک علمی نکتے کی رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ جب پاکستان میں توہین رسالت کی سزا کا قانون پاس ہو گیا تو اہل مغرب نے (جن کی تہذیب کی بنیاد انسانی خواہشات و ہوا پرستی پر ہے اور وہ سماوی ادیان اور اسلام کے اس فلسفے کو نہیں مانتے کہ انسانی معاشرے کے خلاف بڑے اور قبیح جرائم کی سزا سخت ہونی چاہیے اور اس کے اس فلسفے کا نتیجہ خود مغرب میں یہ نکلا ہے کہ وہاں جرائم کی شرح ساری دنیا سے زیادہ ہے اور معاشرہ فساد فی الارض میں مبتلا ہے) اس کی مخالفت شروع کر دی اور اسے ظالمانہ اور کالا قانون اور انتہا پسندی اور دہشت گردی کا قانون قرار دینے کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ امریکی اور یورپی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور ان کی حکومتیں علی الاعلان اس قانون کو ختم کرنے یا سزا کو نرم کرنے کا مطالبہ کرتی رہیں اور کر رہی ہیں۔ اس کے لیے انہیں پاکستانی معاشرے سے بھی مدد درکار تھی چنانچہ بعض اطلاعات کے مطابق پاکستانی میڈیا (خصوصاً ایک خاص میڈیا گروپ میں) بھاری سرمایہ کاری کی گئی جس نے ذرا سوچے! اور طرح طرح کی پُر فریب ٹیکنیکس سے توہین رسالت کی سزا (سزائے موت) کے خلاف محاذ آرائی شروع کی خصوصاً جب آنجہانی گورنر پنجاب کو اس کے ایک محافظ نے توہین رسالت کے جرم میں اشتعال میں آ کر قتل کر دیا (اب عدالت نے بھی یہ تسلیم کر لیا ہے کہ سابق گورنر نے یہ جرم کیا تھا) تو اہل مغرب اور اس کے پاکستانی ہم نواؤں کو اس قانون کے خلاف مکروہ پروپیگنڈے کا موقع مل گیا۔ انہیں اپنی مدد کے لیے پاکستان کے ہزاروں علماء کرام اور سکالرز میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو ان کی حمایت کرتا سوائے جاوید غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں خصوصاً جناب عمار خان ناصر صاحب کے اور ان کے پاس بھی کوئی دلیل یا علمی نکتہ نہیں تھا کیونکہ ساری امت پچھلے چودہ سو سال سے اس امر پر متفق ہے کہ اگر کوئی بد بخت مسلمان آنجناب ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو وہ مستحق سزائے موت ہے، لہذا غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب نے خلط ممحٹ کرتے ہوئے، ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق ذمی کی توہین رسالت کی سزا پر بعض خفی علماء کی رائے کو اچھالنا

شروع کر دیا کہ یہ جرم تو قابل معافی ہے اور اس پر ہلکی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

بھائی! سلیمان تاثیر ذی نہیں تھا، قانوناً مسلمان تھا لہذا ذمی کی معافی کی بحث کی یہاں کیا تنگ اور اس بحث کو یہاں چھیڑنے کا کیا فائدہ؟ لیکن انہوں نے عین انہی دنوں یہ بحث چھیڑی اور مغرب کے حامی طبقوں اور میڈیا نے اسے خوب اچھالا اور یوں مغرب زدہ 'ماڈرن' اور 'لبرل' مسلمانوں کو عمار ناصر صاحب اور جاوید غامدی صاحب نے دلائل مہیا کیے کہ سزائے موت کا قانون تو بڑا سخت اور انتہا پسندانہ قانون ہے جب کہ فقہاء تو گستاخ کی معافی اور کم سزا کے بھی قائل ہیں اور اس کے لیے یہ اور یہ رخصتیں موجود ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ توہین رسالت جیسے متفق علیہ اور نازک مسئلے پر عمار ناصر صاحب کا غلط مبحث اور مغالطوں کے ذریعے پاکستانی مسلمانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے والا کردار خود جاوید غامدی صاحب سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ غامدی صاحب اپنے وسیع دینی مطالعے اور عربی دانی کے باوجود ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں (گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز) اور کوئی مضبوط علمی پس منظر نہیں رکھتے، جب کہ عمار ناصر صاحب حنفی دیوبندی مکتب فکر کے ایک بڑے علمی گھرانے کے فرزند ہیں۔ ان کے دادا مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم امام اہل سنت کہلاتے تھے، بیسویں علمی کتابوں کے مصنف تھے اور برصغیر کے دیوبندی علماء میں ایک بڑا مقام رکھتے تھے اور دیوبندی حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ مسلمہ تھا اور ہے۔ ایسے علمی گھرانے سے تعلق کی وجہ سے لوگ فطری طور پر عمار ناصر صاحب کی عزت بھی کرتے ہیں اور ان کی بات بھی سنتے ہیں (جب کہ بد قسمتی سے ان کے والد مولانا زاہد الراشدی صاحب بھی 'علمی اختلاف' کا الاؤنس دیتے ہوئے عمار ناصر صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں)۔

ان حالات میں اگر مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے عمار ناصر صاحب کے موقف کے خلاف یہ کتابچہ طبع کیا ہے تو یہ وقت کی ضرورت تھا تا کہ اس موضوع کے حوالے سے جو فکری انتشار عمار ناصر صاحب نے (جاوید غامدی صاحب کے ساتھ مل کر) پھیلا یا ہے، اس کا سد باب ہو سکے اور لوگ اصل حقائق جان سکیں۔ ظاہر ہے مفتی صاحب نے صرف نفس مسئلہ کی علمی جہت کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور عمار صاحب کے موقف کی کمزوری ثابت کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جس 'شان نزول' اور پس منظر میں عمار صاحب لکھ رہے ہیں اس کا ذکر کیے بغیر پوری بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی لہذا ہمیں یہ طور لکھنا پڑی۔

ہم نہ عمار ناصر صاحب کی علمیت کے منکر ہیں اور نہ ان کے حق اختلاف کے، کہ علمی اختلاف کی

گنجائش تو ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں حق و باطل کی جو جنگ اس وقت جاری ہے (اور وہ ہم نے نہیں مغرب نے چھیڑ رکھی ہے کیونکہ اس کی تہذیب غالب ہے اور وہ اسے مسلم معاشرے میں بھی غالب دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگ نام کے مسلمان تو رہیں لیکن اس کی فکر اور تہذیب کو اپنائیں) اس میں ہمارا وزن کس کے پلڑے میں جاتا ہے؟ ہم عمار ناصر صاحب اور جاوید غامدی صاحب کی فکر کو اس لیے مبنی برتجدد اور غلط سمجھتے ہیں کہ وہ دین کی ایسی تعبیرات کو ابھارتے ہیں جن سے مغرب کی لحدانہ فکر و تہذیب اور اسلام و مسلم دشمن مغرب کو کمک پہنچتی ہے، ان کے نقطہ نظر کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور مسلم معاشرے میں فکری انتشار پیدا ہوتا ہے جو اس کی ایمانی، اخلاقی اور فکری صحت کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں (آمین یا رب العالمین)۔

کرنا کیا ہے؟

پاکستان کے مفکرین، کالم نگار، علماء، حکماء، شعراء اور دانش ور ہمیشہ مسائل کا رونا روتے رہتے ہیں اور کہانیاں سناتے رہتے ہیں..... کوئی ہمیں قابل عمل حل نہیں بتاتا جس پر پوری قوم اتفاق کرے۔ اس کی بجائے قوم کو مزید کنفوژ کر دیا جاتا ہے۔ اس صدی کا عملی، عقلی اور تعلیمی انسان وہ ہے جو اپنے مسائل کا تجزیہ کرے اور ناقدانہ انداز میں سوچ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرے۔ خدا را اب ہمیں کوئی قابل عمل حل بتائیں۔ (ڈاکٹر انعام اللہ، انٹک)

معلومات داخلہ برائے سعودی یونیورسٹی

وہ حضرات جنہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں ایف اے یا اس کے مساوی، یا کسی دینی مدرسے سے العالیہ کی سند حاصل کی ہو اور ان کی عمر ۲۳ سال سے زائد نہ ہو، یا پچھلے پانچ سالوں میں بے اے کی سند حاصل کی ہو اور عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو۔

رابطہ :

پروفیسر ڈاکٹر رانا خالد مدنی (فاضل مدینہ یونیورسٹی، پی ایچ ڈی) سابق مترجم مولجہ شریفہ، مسجد نبوی، مدینہ منورہ، چیئر مین ادارہ اشاعت اسلام لاہور۔ رابطہ: ۶۰۵۵-۴۴۷-۰۳۰۶

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

- | | |
|---------|---|
| اردو | ۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل |
| | ۲۔ ہمارا دینی نظام تعلیم |
| | ۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی |
| | ۴۔ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل |
| | ۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش |
| | ۶۔ اسلام اور تزکیہ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ) |
| | ۷۔ حقیقت تزکیہ نفس |
| | ۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول) |
| | ۹۔ اسلام اور پاکستان |
| | ۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی |
| | ۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون |
| | ۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں) |
| | ۱۳۔ مطالعہ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم) |
| بروشرز | ۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام |
| | ۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟ |
| | ۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات |
| | ۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام |
| | ۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ |
| | ۱۹۔ حقیقت تصوف |
| انگریزی | ۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols) |
| | ۲۱۔ Noble Quran, Part 1 |
| | ۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan |
| عربی | ۲۳۔ السلطة التشريعية - دراسة مقارنة |

